الجامعة الاسلامية العالمية

International Islamic University, Islamabad

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ سعدیہ بی بی رجسٹریشن نمبر 283-FLL/MSURDU/S21 نے ایم ایس اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان "**تاریخیت کے تناظر میں سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا تجزیاتی مطالعہ**" میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

ڈاکٹر سائرہ بتول
انچارج شعبہ اردو (خواتین)
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

TH-27781

MS
910
سں ٤ ت

سفرنامہ

نادر کیت کے تنا صدزمیں سفرنامہ

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **SADIA BIBI**

Title of the Thesis: **تاریخیت کے تناظر میں سفرنامہ میں ہوں جہاں گرد کا تجزیاتی مطالعہ**

Registration No: **283-FLL/MSURD/S21**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner:

Dr. Aqlima Naz
Assistant Professor/ Incharge
Fatima Jinnah Women University
Rawalpindi

Internal Examiner:

Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

Rupees 50 ۵۰ روپیہ

بیان حلفی

مسماۃ سعدیہ بی بی دختر غلام غوث، رجسٹریشن نمبر 283-FLL/MSURDU/S21 ساکن ڈھونگ، تحصیل گوجر خان، ضلع راولپنڈی یہ قرار کرتی ہوں کہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان تاریخیت کے تناظر میں سفرنامہ "میں ہوں جہاں گرد" کا تجزیاتی مطالعہ برائے حصول ایم ایس ڈاکٹر سائرہ بتول کی زیر نگرانی اپنی محنت سے تحریر کیا ہے۔

یہ کہ مقالہ سرقے سے پاک ہے اور اس میں تحقیق اور تنقید کے اصول وضوابط کو مدنظر رکھا گیا ہے نیز اس سے پہلے یہ کسی جامعہ میں برائے حصول سند پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں شامل تمام حوالہ جات کا استناد موجود ہے اور میں مقالے کے تمام نتائج تحقیق کی ذمہ دار ہوں۔

بیان مندرجہ بالا میرے علم و یقین کے مطابق صحیح اور درست ہے اور اس میں کوئی امر مخفی یا پوشیدہ نہیں رکھا گیا ہے۔

المرقوم: 08-06-2023

المحلفہ ______________

نام: سعدیہ بی بی دختر غلام غوث

شناختی نمبر: 37401-7211149-0

گواہ (۱) ______________ گواہ (۲) ______________

نام: ______________ نام: ______________

ATTESTED

فہرست ابواب

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
ا۔	پیش لفظ	2
۲۔	باب اول:	
	تاریخیت: بنیادی مباحث	
	فصل اول: تاریخیت کے بنیادی مباحث	5
	فصل دوم: سفر نامہ: ارتقا، روایت و فن	24
۳۔	باب دوم:	44
	سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں زمانی انسلاک: ایک مطالعہ	
۴۔	باب سوم:	78
	سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تہذیبی اقدار کی پیش کش	
۵۔	باب چہارم:	110
	سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تاریخی، سیاسی سماجی پیش کش	
۶۔	ماحصل	141
۷۔	کتابیات	146

پیش لفظ

سفر نامہ اردو ادب کی ایک مقبول بیانیہ صنف ہے جس میں سفر نامہ نگار سفر کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات، مشاہدات اور قلبی کیفیات کو بیان کرتا ہے۔ سفر کے دوران سفر نامہ نگار دلکش مناظر کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ان ممالک کی تہذیب، ثقافت، سیاسی و سماجی حالات اور تاریخ کو بیان کرتا ہے۔ سفر نامہ دوسرے ممالک کی تاریخ اور تہذیب و تمدن کو دوسروں تک پہچانے کا اہم ذریعہ ہیں۔ سفر نامہ نگار کی نگاہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہوتا ہے اپنے سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کو اس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ اس خطے کے مناظر کے ساتھ اس عہد کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور قاری خود کو اس عہد ہی کا فرد سمجھتا ہے۔

تاریخیت کسی بھی ادبی فن پارے کو جانچنے کے لیے اس عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تاریخی تناظر میں دیکھنے پر زور دیتی ہیں۔ فن پارہ چاہے کسی بھی دور کی تخلیق ہو لیکن اس میں اپنے عہد کی روح منعکس ہوتی ہے اس لیے ادب پارے کو اس کے زمانی و مکانی تناظر میں جانچا جاتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کو اس عہد سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے دور کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ تاریخیت کا ماننا ہے کہ واقعات اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔

سفر نامہ اردو ادب کی وہ صنف ہے جس میں سفر نامہ نگار جس عہد میں سفر کرتا ہے اس عہد کی تاریخ، تہذیب، سیاست، مذہب اور وہاں کے سماج کو بیان کرتا ہے۔ تاریخیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ ادب کا مطالعہ اس عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تاریخی تناظر میں کیا جائے۔ سفر نامے میں اپنے عہد کی ایک مکمل تصویر نظر آتی ہے کیونکہ سفر نامہ نگار ان واقعات کو بیان کرتا ہے جس کا وہ چشم دید گواہ ہوتا ہے اور تاریخیت کا بھی تقاضا یہی ہے کہ فن پارے کا مطالعہ اس کے عہد کے تناظر میں کیا جائے۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد اپنے عہد میں کیے گئے سفر کی تاریخ، تہذیب، سیاست، مذہب اور سماج کی تصویر کشی کرتا ہے۔ فرخ سہیل کا شمار دورِ حاضر کے معروف لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ابتدائی شہرت صحافی اور سوشل ایکٹوسٹ کے طور سے ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مختلف ممالک کا سفر کیا اور اس سفری روداد کو میں ہوں جہاں گرد کی صورت میں پیش کیا۔ یہ ان کا پہلا سفر نامہ ہے جس کی وجہ سے ان کی شہرت جدید سفر نامہ نگاروں میں ہونے لگی۔

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد ۱۹۸۳ء میں کی گئی تین ممالک (ایران، ترکی اور بلغاریہ) کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ یہ سفر نامہ ضخیم کتابی صورت میں ۲۰۲۱ء میں جمہوری پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اس سفر نامے میں فرخ سہیل نے تینوں ممالک کے سیاسی، سماجی، مذہبی، تہذیبی اور تاریخی حالات و اقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا تاریخیت کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے میں ان تینوں ممالک کی تاریخ، سیاسی و سماجی حالات اور تہذیبی اقدار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں "تاریخیت: بنیادی مباحث" کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں تاریخیت کے بنیادی مباحث پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب میں تاریخیت کی تعریف، اس کا ادب کے ساتھ رشتہ، تاریخ، تاریخیت اور ادب کے آپس میں رشتے کی وضاحت کی گئی ہے۔ ادب اپنے عہد سے کس طرح جڑا ہے اس پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں ان تاریخی عناصر پر بحث کی گئی ہے جو کسی بھی ادبی فن پارے کو جانچنے کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرا حصہ " سفر نامہ؛ تعارف، روایت و فن" کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں سفر نامے کی تعریف، ارتقا اور فن پر بحث کی گئی ہے اور اسی حصے میں فرخ سہیل گوئندی کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا باب " سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں زمانی انسلاک: ایک مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔ باب دوم میں فن پارے میں تحریر کردہ اُن واقعات کا مطالعہ کیا گیا ہے جو اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس باب میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کون کون سے محرکات ہوتے ہیں جو زمانی انسلاک کا باعث بنتے ہیں اور اُن محرکات کی روشنی میں سفر نامے میں موجود واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے، جو اپنے عہد کا بیان ہیں یہ واقعات ۱۹۸۳ء کے عہد کے تناظر میں دیکھے گئے جب سفر نامہ نگار نے سفر کیا۔ تیسرا باب جو کہ " سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تہذیبی اقدار کی پیش کش" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ایران، ترکی اور بلغاریہ کی تہذیبی اقدار کا جائزہ لیا گیا ہے، تینوں ممالک کے نمایاں قومی افکار، رسوم و رواج، رہن سہن اور طرزِ زندگی کا تفصیلی محاکمہ کیا گیا ہے۔ چوتھے باب کا عنوان " سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تاریخی، سیاسی، سماجی پیش کش" ہے جس میں تینوں ممالک کی تاریخ، سیاست اور سماج کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اللہ رب العزت کی خاص نوازش اور مہربانی ہے کہ انھوں نے مجھے اس قابل بنایا کہ آج میں اپنا ایم ایس کا مقالہ مکمل کرنے کے قابل ہوئی۔ تحقیق ایک دقت آمیز اور وقت طلب کام ہے جس کے لیے پختہ ارادے، ہمت اور حوصلے کے ساتھ مناسب وسائل کا ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ ان کی عطا کے باعث میں اپنا کام وقت پر پورا کرنے کے قابل ہوئی۔

میں اپنے شعبۂ اُردو کے قابل قدر اساتذہ کرام کی شکر گزار ہوں کہ ان کی رہنمائی اور معاونت کی وجہ سے یہ مرحلہ احسن طریقے سے طے ہو پایا، اگر ان کی بھرپور رہنمائی اور معاونت حاصل نہ ہوتی تو شاید تحقیق کا یہ مشکل مرحلہ کبھی طے نہ کر پاتی۔ دوران تحقیق فرخ سہیل گوئندی کا خصوصی تعاون حاصل رہا تحقیق سے متعلق مواد کی فراہمی پر ان کی خصوصی شکر گزار ہوں۔ میں اپنی نگران ڈاکٹر سائرہ بتول کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی شفقت اور مکمل توجہ مجھے ہر وقت حاصل رہی۔ انھوں نے اس مقالے میں میری مکمل رہنمائی کی اور میری حوصلہ افزائی کی۔ میں مٹی کے ان محرابوں کی شکر گزار ہوں جن سے نکلتی دعاؤں نے میرا حوصلہ بلند رکھا اور مجھے کبھی تنہا ہونے نہیں دیا والدین کی انہی دعاؤں کی بدولت میں آج یہاں اس منزل کو سر کر پائی۔ خاص طور پر میں اپنے بھائیوں کی مشکور ہوں جن کی دعائیں، شفقت اور مالی معاونت میرے ساتھ رہی۔ جنھوں نے قدم قدم پر میری ہمت بڑھائی اور اس مشکل مرحلے کی تکمیل کو میرے لیے آسان بنایا۔ میں اپنی بہنوں، تمام دوستوں اور احباب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں جنھوں نے تحقیق کے دوران میری مدد کی۔ آخر میں ایک بار پھر رب تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جنھوں نے میری دعاؤں کو قبولیت کا شرف بخشا اور منزل تک پہنچنے کے لیے آسانیاں پیدا کیں۔

سعدیہ بی بی

باب اوّل:

فصل اول :تاریخیت:بنیادی مباحث

تاریخیت سے مراد کسی بھی تخلیقی فن پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے عہد کو مدِ نظر رکھنا اور تاریخی تناظر میں اس فن پارے کو موجودہ عہد میں جانچنا یا پرکھنا ہے۔جب کوئی فن پارہ تخلیق ہوتا ہے تو اس پر اس دور کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اثرات ہوتے ہیں۔تاریخیت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس دور میں فن پارہ تخلیق ہوا اس دور کے سیاسی و سماجی اور تہذیبی حالات و واقعات کیا تھے ؟اور موجودہ دور میں ان کا مطالعہ کیسے کیا جاتا ہے ؟تاریخیت کو سمجھنے کے لیے تاریخ کو زیرِ بحث لانا ضروری ہے کیونکہ تاریخ میں ایک خاص عہد، قوم اور حالات و واقعات اور زمانے کی تبدیلیوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

تاریخ عربی زبان کا لفظ ہے اور بطور اسم مستعمل ہے۔اس کا مادہ "ارخ" ہے۔فیروز الغات میں تاریخ کے معنی ا۔مہینے کا ایک دن ۲۔کسی چیز کے ظہور کا وقت ۳۔وہ کتاب جس میں بادشاہوں اور مشہور آدمیوں کے حالات اور اس عہد کے واقعات درج ہوں ۴۔جملے یا شعر یا فقرے جن کے عدد نکالنے سے مادہ تاریخ نکل آئے ۵۔روایات، قصے ،افسانے ۶۔جنگ نامے [۱]۔

فرہنگ آصفیہ میں تاریخ کے معنی ا۔کسی چیز کے ظہور کا وقت ۲۔کسی امرِ عظیم کے وقت کا تعین، زمانہ کا تعین ۴۔(قانون) وہ دن جو مقدمہ کی پیشی کے لیے مقرر کرے۔ پیشی کے مقدمہ کا دن [۲]۔تاریخ سے مراد یہ ہے کہ ماضی کے واقعات ، بادشاہوں اور امراء کا ذکر تحریری صورت میں بیان کرنا ہے۔تاریخ محض ماضی کے واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں اس دور کے تہذیبی، سیاسی، سماجی ،اقتصادی، مذہبی ، معاشی اور معاشرتی حالات و واقعات جو سچائی پر مبنی ہوتے ہیں ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔تاریخ کسی خطے یا علاقے کے ماضی کے حالات و واقعات کی تشریحات و توضیحات کا نام ہے۔تاریخ تہذیب و ثقافت اور جغرافیائی ارتقائی تبدیلیوں کے زیرِ اثر وجود میں آتی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس پر اس معاشرے کے فکری اثرات بھی مرتب ہوتے

ہیں۔ہر علاقے کی اپنی ایک خاص پہچان، تہذیب، ثقافت، فکر اور جغرافیائی حدود ہوتی ہیں اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں کو ایک ترتیب کے ساتھ تاریخ میں بیان کیا جاتا ہے۔بقول ڈاکٹر صادق علی گل:

> مختلف زمانوں میں مختلف افراد، طبقے اور قومیں معاشرتی، سیاسی، مذہبی، اقتصادی یا تہذیبی لحاظ سے جو انداز فکر اختیار کرتی ہیں، واقعات تاریخ ان ہی کا نچوڑ و مجموعہ ہوتے ہیں۔ جس سرعت کے ساتھ قوموں اور ملکوں کی کشمکش کے انقلابی حادثات و واقعات رونما ہوں گے، اسی رفتار کے ساتھ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوں گی اور اسی تسلسل کے ساتھ تاریخ جنم لے گی۔ (۳)

عام طور پر سیاسی، جغرافیائی، مذہبی اور تہذیبی ارتقائی تغیر کی بنا پر لکھی جانے والی تاریخ کو سیاسی، مذہبی، سوانحی، سائنسی، جنگی اور علاقائی تاریخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔چند ایک کا یہاں مختصر تعارف کیا پیش جاتا ہے۔

سیاسی تاریخ:

سیاسی تاریخ میں کسی علاقے کی حکومت، افراد، معاشرے پر حکومت کے اثرات اور وہاں کی روایات پر بحث کی جاتی ہے۔سیاسی تاریخ میں عہد بہ عہد ریاست اور حکومت کی تنظیم، ان کی ذمہ داریوں، ان کے مقاصد، اس دور کے اہم معاشرتی و معاشی مسائل پر بحث کی جاتی ہے۔سیاسی تاریخ کو صادق علی گل نے یوں بیان کیا ہے۔

> سیاسی تاریخ کا تعلق ریاست معاشرے اور حکومت سے ہے۔سیاست تاریخ ریاست و حکومت کی بنیادی اقدار اس کی ہیئت، اقسام اور نشوونما کا جائزہ پیش کرتی ہے یعنی یہ ریاست و حکومت کی مختلف حیثیتوں سے بحث کرتی ہے۔ (۴)

سیاسی تاریخ میں ان واقعات، سیاسی تغیرات اور حوادث کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو سیاسی نظام ریاستی تشکیل اور سیاسی شخصیات اور تجربات کی وضاحت کرتی ہے۔ تاریخ کے اہم واقعات میں سے ایک حکومتی تشکیل ہے، کسی ملک میں حکومتی نظام کی تشکیل کا طریقہ کار کی وضاحت کی جاتی ہے۔مثال کے طور پر مشروعیت یا جمہوریت وغیرہ کی بنیاد پر حکومتی تشکیل وغیرہ۔سیاسی تاریخ میں سیاسی جنگوں کا اہم کردار ہے۔سیاسی جنگیں مختلف مقاصد مثلاً اقتدار وغیرہ کے حصول کے لیے لڑی جاتی ہیں۔انقلابات بھی سیاسی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔انقلابات کی وجہ سے عوامی تشدد، اٹھنے والی تحریکیں، سیاسی تغیرات سیاسی تاریخ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بعض سیاسی نظریات بھی بہت اہم ہوتے ہیں جو پوری سیاسی تاریخ کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ کسی معاشرتی نظام میں سیاسی اصولوں، قوانین اور اقدامات کی وجہ سے ملک کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے مثال کے طور پر مغل سلطنت کا دور اور پھر اس کے بعد وہاں آکر بسنے والے برطانوی حکومت کی وجہ سے ملک کی صورتحال تبدیل ہو گئی۔ قومی آزادی کی تحریکیں بھی سیاسی تاریخ کا حصہ ہیں جو ملکوں یا قوموں کی سیاسی،

سماجی اور اقتصادی حالات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ تحریکیں عموماً ملکوں کی غیر مستعمل حکومتوں، برطانوی راج، استعمار، ظلم و ستم، یا کسی دیگر نظام کے خلاف آزادی یا حقوق کی مطالبہ کے لئے آغاز ہوتی ہیں۔ یہ تحریکیں عام طور پر اساسی حقوق، آزادی، عدل و انصاف، یا خود مختاری کی مطالبہ کرتی ہیں۔ ان تحریکوں کے دوران مختلف سیاسی اقدامات کیے جاتے ہیں جن میں احتجاجات، جلوس، جنگ، سیاسی مذاکرات، قومی یا عالمی جمعیتوں کی تشکیل، وغیرہ ہیں۔ قومی آزادی کی تحریکوں کا مقصد عموماً سیاسی تغیر، خود مختاری، حکومت یا سیاستی نظام کی تشکیل، سیاسی حقوق یا عدل و انصاف کی تحقیق یا کسی مخصوص مسئلے کو حل کرنا ہوتا ہے۔ ان تحریکوں کی تاریخ سیاسی تاریخ کا حصہ بنتی ہے کیونکہ یہ واقعات اور عوامل پر منحصر ہوتی ہیں جو سیاسی نظام، حکومت، رہنماؤں، جماعتوں، اقوام و ممالک کے لئے بنیادی تبدیلیاں لاتی ہیں۔ ان تحریکوں کی تاریخ سیاسی تحولات کا حصہ ہوتی ہے اور یہ ملکوں اور قوموں کی تاریخی تشکیل و تحرک کو نمایاں کرتی ہیں۔

سماجی تاریخ:

سماجی تاریخ میں انسان کے سماج کے ساتھ تعلق کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک انسان کا رہن سہن اور اس کے ارد گرد ماحول کا کیسا ہے؟ وہ اپنے سماج سے کس طرح جڑا ہوا ہے انسان اپنی روایات سے جڑا ہوتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔ فرد اپنے سماج سے جڑا ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک انسان دوسرے سماج کے لوگوں سے ملتا جلتا رہتا ہے اس کے اثرات بھی اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ سماج میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مثلاً سائنسی ترقی نے زرعی سماج کو متاثر کیا جہاں پہلے لوگ ہاتھ سے بنے اوزار کا استعمال کرتے تھے وہاں مشینوں نے جگہ لے لی جس کے اثرات معاشرے پر بھی مرتب ہوئے۔ سماجی تاریخ میں سماجی، ثقافتی اور اجتماعی واقعات اور تغیرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس میں ان وقائع کا جائزہ لیا جاتا ہے جن کا سماجی جماعتوں، گروہوں اور خاندانوں سے تعلق ہوتا ہے۔ سماجی تاریخ میں سماجی سطح پر ہونے والے تغیرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ تعلیمی اصلاحات، عمومی سوچ میں تبدیلی، معاشی ترقی، خاندانی نظام کی تبدیلی اور ثقافتی تغیرات وغیرہ سماجی تاریخ کا حصہ بنتے ہیں۔ اس میں مختلف معاشروں، جماعتوں اور فرقوں کی تشکیل اور ترقی پر توجہ دی جاتی ہے۔ سماجی تاریخ میں اقتصادی، ثقافتی، دینی، فکری اور اخلاقیات کے عوامل شامل ہیں۔ اس میں سماجی روابط ترقی اور تبدیلیوں انقلابات جنگوں، سیاسی، اقتصادی اصلاحات و انتظامات اور انسانی ترقی پر بحث کی جاتی ہے۔

مذہبی تاریخ:

مذہبی تاریخ کا تعلق مذہبی، دینی اور روحانی معاملات سے ہے۔ مذہبی تاریخ میں مذہب سے متعلقہ امور مثلاً عقائد، اخلاقیات پر بحث اور ان کے معاشرے پر کیا اثرات تھے؟ کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ کسی بھی ملک پر وہاں

کے مذہبی اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور مذہب کے اثرات معاشرے کی ہر سطح پر نمایاں ہوتے ہیں۔ مذہبی تاریخ مذہبی گروہوں، مذہبی شخصیات اور اہم مذہبی واقعات اور دیگر مذہبی امور کا مطالعہ کرتی ہے۔ مذہبی تاریخ میں اسلام اور دیگر ادیان کا آپس میں تقابل کیا جاتا ہے۔

سوانحی تاریخ:

سوانحی تاریخ کا شمار قدیم تاریخوں میں ہوتا ہے۔ سوانحی تاریخ میں مشہور اور اہم شخصیات کے حالات و واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ سوانحی تاریخ کو سوانح عمری بھی کہا جاتا ہے۔ سوانحی تاریخ میں صرف ایک شخص کی زندگی کو بیان نہیں کیا جاتا بلکہ اس میں پورے ایک عہد کی تصویر نظر آتی ہے، اس میں اہم تاریخی واقعات، تاریخی مقدمات، دوسری شخصیات اور مختلف دوروں کے واقعات کو اس عہد کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا جاتا ہے جس سے تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سوانحی تاریخ میں عام طور پر وہ واقعات شامل ہوتے ہیں جو تاریخی، سیاسی، سماجی تہذیبی اور معاشرتی نوعیت کے ہوتے ہیں جو اپنے عہد کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ اس سے عام لوگوں کو تاریخی واقعات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مشہور سوانح عمریاں سیرۃالنبیؐ، حیات سعدی، الفاروق، حیات کارلائل اور حیات نپولین وغیرہ ہیں۔

علم تاریخ میں معاشیات کو بھی اہمیت دی جاتی ہے ایک علاقے کے رہنے والوں کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ ان کی آمدن اور اخراجات پر بھی بحث کی جاتی ہے۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے ان کی آمدنی اور اخراجات میں کتنا توازن ہے اور ذرائع آمدن کے معاشرے پر کیا اثرات ہیں؟ اس میں ان ذرائع اور تغیرات کا جائزہ لیا جاتا ہے جس میں معاشی نظام، اور اقتصادیات پر اثر چھوڑتے ہیں۔ علم تاریخ میں معاشیات کا جائزہ لیتے ہوئے معاشی ترقی کے منصوبوں، مالیاتی پالیسیوں، تجارتی پالیسیوں اور معاشی تنظیموں کی تشکیل کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔

علم تاریخ کا اہم حصہ ماحولیات بھی ہے ی ماحولیات علم کی شاخ ہے جو زمین پر موجود حیاتی اور غیر حیاتی عناصر کے درمیان تعاملات کا مطالعہ کرتی ہے۔ یہ ایک وسیع شعبہ ہے جو ہوا، پانی، مٹی، جنگلات، جانوروں، پودوں اور دیگر ماحولیاتی عناصر کی تشکیل اور ترکیب کو سمجھنے پر زور دیتا ہے۔ ماحولیات کے مطالعہ میں عموماً زمینی ماحول پر اثر انداز ہونے والے تغیرات کو شامل کیا جاتا ہے جو اس کے عناصر کی تعداد، ترکیب، حرکت میں تبدیلیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجوہات، ان کے اثرات اور ان کا پتہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ ماحولیات کے موضوعات میں طبعی حالات، سیاسی واقعات معاشرتی تخریب کاریاں، مذہبی اثرات، ملکی حالات صنعتی تشکیلات وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے۔ ماحولیات میں انسان کے اور ماحول کے آپس کے تعلقات پر بحث کی جاتی

ہے۔ارد گرد کے ماحول کے مثبت یا منفی اثرات سے انسان کے طرز عمل میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔تاریخ کی وضاحت میں ماحولیات کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔اس میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ماحول نے تاریخ پر کیا اثرات مرتب کیے ،وقت کے ساتھ ساتھ ماحول میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں؟قدرتی آفات ، ہجرت،نو آبادیات اور سائنس کی ترقی کی بدولت نئی ایجادات ماحول پر کس طرح اثرانداز ہوئیں؟

تاریخ پر نو آبادیات کے اہم اثرات ہیں جب کوئی قوم باہر سے آکر دوسری قوم پر اپنا تسلط جماتی ہے تو اس میں ایک باہر سے آنے والی قوم حاکم اور مقامی قوم محکوم کے طور پر زندگی بسر کرتی ہے۔اس طرح دو تہذیبیں آپس میں مدغم ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں ایک نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔

نو آبادیات کے بعد مابعد نو آبادیات کا دور ہوتا ہے یعنی جب محکوم قوم حاکم قوم سے آزادی حاصل کر لیتی ہے تو وہ آزادی کے ساتھ کس طرح اپنی زندگی بسر کرتی ہے اور حاکم قوم کی تہذیب محکوم قوم پر کیا اثرات چھوڑتی ہے؟ یہ سب عناصر مل کر تاریخ کو جنم دیتے ہیں۔ہر قوم کی اپنی تاریخ ہوتی ہے جس سے اس کی الگ پہچان اور منفرد مقام ہوتا ہے۔

تاریخیت ایک ایسی ادبی اصطلاح ہے جس سے مراد کسی بھی ادبی فن پارے کا اس کے عہدِ تخلیق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سیاسی، سماجی، مذہبی اور تاریخی تناظر میں تجزیہ کرنا ہے۔جب کسی ادب پارے کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس کے دور کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور ادبی فن پارے کو اس کے زمانی و مکانی تناظر میں جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔تاریخیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ واقعات اپنے عہد کی سیاسی و سماجی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔

ادب ،انسان اور تاریخ کا رشتہ آپس میں بہت گہرا ہے۔یہ تینوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔انسان کے ماحول، معاشرت اور سماج کا تعلق تاریخ سے بہت گہرا ہے۔جب شعراء اور ادباء کی تخلیقات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کے ماحول اور اس کے عہد کو بھی مدِ نظر جاتا ہے کہ اس وقت کیا حالات وواقعات تھے؟ رہن سہن اور طرزِ معاشرت کیسا تھا؟اس وقت کی ثقافت کیسی تھی؟اس وقت کی ثقافت اور اب کی ثقافت میں کتنا فرق آچکا ہے؟ ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے اس دور کے حالات و واقعات سے آگہی ضروری ہے جس دور میں ادب تخلیق ہوا۔ایک مخصوص معاشرے ،ماحول کے اثرات انسان پر اثرانداز ہوتے ہیں اور حساس لوگ اس سے زیادہ اثر قبول کرتے ہیں خاص طور پر شعراء اور ادباء اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور یہ اثر ان کی تخلیقات میں نمایاں نظر آتا ہے۔اس کی مثال یوں پیش کی جاسکتی ہے کہ زمانہ قریب میں کرونا کی وبا نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس وقت جو حالات و واقعات تھے وہ موجودہ دور سے بہت مختلف تھے۔اس دور نے ہر انسان کو متاثر کیا۔چونکہ ادیب بھی اس سے متاثر

ہوئے اور اس دور میں جو ادب تخلیق ہوا وہ بھی اسی کے زیرِ اثر تھا۔ اسی لیے جب بھی کسی دور کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس دور کے سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ ادب اپنی تاریخ کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ ادیب یا شاعر اپنا موضوع اپنے گرد و پیش کے حالات چاہے وہ سیاسی، جذباتی، مذہبی یا تہذیبی ہوں ان ہی سے اخذ کرتا ہے۔

اس حوالے ڈاکٹر محمد اشرف کمال کا کہنا ہے:

> ادب روحِ عصر سے تازہ سانسیں وصول کرتا ہے، ہر ادیب زمانے اور ماحول سے اثرات قبول کر کے ادب تخلیق کرتا ہے۔ ادیب اپنے مسائل اور رجحانات کو خوبصورت لفظوں اور لطیف پیرائے میں اپنے فن میں منعکس کرتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی ادیب اور اس کے ادب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس دور کے تاریخی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی حالات کو مدِ نظر رکھا جائے۔(۵)

حالات و واقعات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا حصہ بنتے ہیں اسی طرح ادب بھی وقت کے ساتھ ماضی اور تاریخ کا حصہ بنتا رہتا ہے۔ کسی قوم کے ادب کو وہاں کی تہذیب و ثقافت سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ادب اور تاریخ کا آپس میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ادبی تاریخ عام تاریخ کی نسبت زیادہ مشکل ہے۔ ادب کا تاریخی تناظر میں مطالعہ کیا جاتا ہے تو سنین کے ساتھ ساتھ فن پارے کے عہد کے سیاسی، سماجی و مذہبی حالات و واقعات اور تہذیب و ثقافت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ کسی بھی ادب پارے کا مطالعہ تاریخیت کے اصولوں کے بغیر نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ادب پر اس دور کے رجحانات کا اثر کسی نہ کسی صورت ثبت ہوتا ہے۔

ریاض صدیقی کا کہنا ہے:

> ادب اور تنقید کا تاریخیت سے رجوع کرنا ایک فعال تعمیری رجحان ہے اور اس کی عالمگیر حقیقت پر دلیل کہ آرٹ اور ادب اپنے گرد و پیش سے الگ کوئی شے نہیں۔(۶)

تاریخیت سے مراد ہے کہ فن پارہ جس عہد میں تخلیق ہوا اس پر اس عہد کی فکر، سوچ اور رجحان کا اثر ہوتا ہے اس فن پارے پر جغرافیائی، سیاسی و سماجی، تہذیبی اور مذہبی اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے فن پارہ جس عہد میں تخلیق ہوا اس عہد کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے اور ان تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے عہد کے حالات و واقعات کا تجزیہ کیا جاتا ہے بقول ڈاکٹر ناہید قمر: ''تاریخیت وہ فکری رویہ ہے جو تہذیبی شعور، سیاسی و تاریخی شعور، عصری آگہی اور سماجی درک سے انسلاک رکھنے والے تمام متون کا احاطہ کرتا ہے۔''(۷)

ادیب جب ادب تخلیق کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے عہد کو لکھ رہا ہوتا ہے اور مطالعہ کے دوران قاری خود کو اس عہد کا ناظر محسوس کرتا ہے اور اس پوری تہذیب و تمدن میں قید ہو جاتا ہے۔ فن پارے کی بنیاد تاریخی ہونے کے

باوجود بھی اسے تاریخی دستاویز نہیں سمجھا جاتا کیونکہ ادب محض تاریخی واقعات کا سلسلہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں فکری، لسانی، جذباتی اور حسیاتی سطحوں پر تخلیقی شعور اور تخلیقی اظہار کا سہارا لیا جاتا ہے۔ تاریخی تناظر میں ادب کو حال میں رہتے ہوئے ماضی سے جوڑا جاتا ہے اور تخلیقی تجربے کے ساتھ ساتھ ماضی بھی اس کی توسیع کرتا ہے۔ تاریخیت میں نہ تو واقعات کو ترتیب وار بیان کیا جاتا ہے اور نہ ہی تاریخی، تہذیبی، سیاسی اور عصری شعور سے آگہی ہے بلکہ ڈاکٹر ناہید قمر کا کہنا ہے کہ "تاریخیت تو تاریخی حقائق کے استناد کو برقرار رکھتے فرد اور تاریخ کے باہمی تعامل کو جمالیاتی تجربے میں بدلنے کا نام ہے۔"(۸)

تاریخیت میں ادب کے مطالعے کے دوران کسی خارجی واقعہ کے ساتھ ساتھ کسی منطقی ربط کو بھی تلاش کیا جاتا ہے۔ تاریخیت میں کسی ادب پارے کو اس کا زمانۂ تخلیق اور تاریخی تناظر میں پرکھا جاتا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب کو تاریخ کے بغیر سمجھنا محال ہے۔ کیونکہ تاریخیت میں تاریخ مرکزی حیثیت حاصل کر کے ادب اور تاریخ کے ساتھ سیدھے سادے تعلق کی داعی ہے۔ تاریخیت میں کسی ادبی فن پارے کا اس کے زمانۂ تحریر اور تاریخی تناظر میں جائزہ لیا جاتا ہے اور وہ اس ادبی فن پارے کو وقتِ تحریر اور تاریخی منظر نامے میں دیکھنے کی پیامبر ہے۔ تاریخیت پسندوں کے مطابق تاریخی مقام یا صورتحال یا جائے واقعہ انسان پر اثر انداز ہونے والی سماجی یا تہذیبی خصوصیات کا تعین کرتی ہے۔

سید ازور عباس اور ڈاکٹر مطاہر شاہ کا کہنا ہے:

> اگر کسی فن پارے میں براہ راست متن کا موضوعاتی سطح پر تاریخی تناظر میں جائزہ نہ لیا جا سکے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ تخلیق تاریخیت کے حوالے سے قابل قرأت نہیں بلکہ اس کا تاریخی لسانیات کے تناظر میں مطالعہ کیا جائے گا۔(۹)

تاریخیت تاریخ کے عمل، سمت اور ادب پارے پر اثرات کے مطالعے کا نام ہے جو ادب پارے کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ جو واقعات رونما ہوئے ان کو اس زمان و مکان کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی قدر شناسی بھی کرتا ہے۔ تاریخیت کا یہ ماننا ہے کہ کوئی شے کسی وجہ کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی اور اس شے کی قدر و قیمت کا تعین زمانی و مکانی تناظر کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخیت ادب اور تاریخ کو متوازی رکھ کر اس مطالعہ کرتی ہے اور تاریخ کو ادب پر حاوی قرار دیتی ہے۔ تاریخیت کے نزدیک ادب اور تاریخ کا رشتہ براہِ راست ہے اور ادب کو تاریخ کا آئینہ قرار دیا۔

ادب اور تاریخ کے رشتے کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیّر لکھتے ہیں:

پرانی تاریخیت نے تاریخ کو ادب کے ایک متوازی بیانیے کے طور پر پیشِ نظر رکھا۔۔۔ادب کے بیانیے اور تاریخ کے بیانیے میں رشتہ براہِ راست، سیدھاسادہ اور آئینہ و عکس کا ہے نیز تاریخ کا بیانیہ واحد ہے جس نے افتراقات، تکثیریت کو ابھرنے نہیں دیا اور اس تاثر کو ابھارا کہ یہ بیانیہ کسی عہد کی ہمہ جہت فکری و سماجی اور تخلیقی زندگی کا واحد مگر حقیقی ترجمان ہے۔(۱۰)

کسی بھی تخلیق کو ان ذرائع کے ذریعے تلاش کرنا چاہیے جو اس تخلیق کا باعث بنے یہ ذرائع ہمیں اس ادیب کے گرد و پیش، ماحول اور اس دور میں ملیں گے جب وہ ادب پارہ تخلیق ہوا۔ ماضی کے ادب کو اس عہد کے ماحول، گرد و پیش اور اس عہد کی تخلیقات کا جائزہ لے کر سمجھ سکتے ہیں۔ تاریخ کو برتتے ہوئے جہاں تہذیبی، سیاسی قوتیں حصہ لیتی ہیں وہاں عصری تصورات کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ان تصورات کو شکل دینے میں تاریخ اہم کردار ادا کرتی ہے۔ عصری تصورات ادب پر بلواسطہ یا بلاواسطہ، شعوری یا لاشعوری طور پر اثرانداز ہوتے رہتے ہیں اور جب ناقدین ادب پارے کو پرکھتے ہیں تو اس کا رشتہ اس کے عہد سے جوڑتے ہیں۔ فن پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے تاریخی ناقدین کے ذہن میں جو سوالات ابھرتے ہیں جیسے کہ عہدِ تخلیق میں سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی حالات و واقعات کیسے تھے؟ ان کی نوعیت کیا تھی؟ وغیرہ کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ تاریخی ناقدین یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ معاشرے میں اجتماعی اور انفرادی سطح پر عہد بہ عہد کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں؟ اس کے علاوہ عہد بہ عہد جن تحریکات و رجحانات نے جنم لیا ان کے بنیادی محرکات کیا تھے؟ معاشرے میں وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ جو نئے تصورات ابھرتے ہیں ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور نئے مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ناقدین ادب اور تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ادبی اصناف، ہیئت، اسلوب، لسانی تبدیلیوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور وقت کے ساتھ ان تبدیلیوں کے پیچھے تاریخی اور غیر تاریخی محرکات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

> ادبی مؤرخ یا تاریخی نقاد ادبی تاریخ اور اس کی روایات کی تشکیل کی روشنی میں اپنے تجزیوں کو مرتب کرتا ہے یا عہد بہ عہد سماجی، سیاسی اور تہذیبی محرکات و عوامل پر اپنی ترجیح کی بنیاد رکھ کر ادب و فن کی سمت و رفتار کا تعین کرتا ہے۔(۱۱)

تاریخیت میں تاریخ اہم ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف تاریخی واقعات کو بیان کر دیا جائے بلکہ اس میں تاریخ پڑھنے اور اس کے اصول و ضوابط اور اس کے قواعد پر بات کی جاتی ہے۔ تاریخیت میں تاریخ کے مفہوم کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ واقعات کو ان کے زمانی اور مکانی تناظر میں جانچنے کی کوشش کرتی ہے۔۔تاریخ چوں کہ محرک رہتی ہے اس لیے ہر تخلیق کی قدر شناسی کے معیارات بھی الگ ہوں گے۔ ہر عہد کے اپنے حالات، تقاضے، نظام

اور اخلاق واقدار ہیں اور یہ دوسرے عہد سے مختلف ہوتے ہیں تاریخی نقاد کے مطابق ایک عہد کے تنقیدی معیارات دوسرے عہد کے ادب پر لاگو نہیں کیے جا سکتے۔

اس حوالے سے عتیق اللہ، پروفیسر کا کہنا ہے:

> ادبی نقاد تاریخیت (Historicism) کے حوالے سے ان نئی صورتوں کے سیاقی مظہر اور ان قوتوں اور ان سر چشموں تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے جن کا تعلق تاریخ اور ان کے عمل سے ہے۔ وہ بین الادواری تقابل کے ذریعے زبان میں واقع تدریجی تبدیلیوں الفاظ کی نئی تعبیرات، ترک کردہ، پامال، گم کردہ، غریب، دخیل اور نئے الفاظ اور ان کے نئے خوشوں اور مرکبات، نیز نئے موضوعات اور اشتقاقات جیسی نوعیتوں پر مطالعے کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس کی بنائے ترجیع فن کار اور اس کے فن کے باہمی رشتے کے علاوہ لسان کے اس تاریخی کردار پر بھی ہوتی ہے جو تدریجاً جدلی ہوتا ہے اور مختلف لسانی تہذیبیں جس پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ (۱۲)

تاریخیت ایک وسیع مفہوم ہے جو کسی واقعے، شخصیت، یا دورانیے کے تاریخی حیثیت اور وجود کو بیان کرتا ہے۔ یہ ہمیں ماضی کی معلومات، حالات و وقائع اور تجربات سے آگاہ کرتی ہے جو ہماری توثیق کرتی ہیں اور ہمیں سمجھنے میں مدد کرتی ہیں کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، کیا کیا ہے اور کیا ہو سکتا ہے۔

تاریخیت عموماً مختلف جنبشوں، تحویلات اور تغیرات کی درجہ بندی کرتی ہے جو ماضی کے دوران ہوئے۔ یہ علمی تحقیقات، مطالعات اور نظریات کو ترتیب دیتی ہے تاکہ ہمیں ماضی کے واقعات کی سمجھنے میں مدد مل سکے۔ تاریخیت ہمیں یہ سمجھانے میں مددگار ہوتی ہے کہ ہم آنے والے ادوار کو بہتر سمجھ سکیں اور اُن کے پیچیدہ معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی حقائق کی وضاحت کر سکیں۔ تاریخیت عموماً مختلف تاریخی ذرائع کے ذریعے سے مستند ہوتی ہے مثلاً تاریخ، رِوایات، تاریخی دستاویزات، مخطوطات، نقشہ جات، تصاویر، اور شاہکار عمارتیں وغیرہ۔ ان ذرائع کی مدد سے ہم ماضی کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہیں، دلیلیں جمع کرتے ہیں اور تاریخی رویے کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ تاریخیت علمی تجزیوں کو روشن کرتی ہے اور ماضی کی روشنی میں ہماری مددگار ہوتی ہے تاکہ ہم آنے والے وقتوں کے لئے سبق سیکھیں اور بہتری کی جانب پیش قدمی کریں۔

تاریخ کا تعلق ان علوم سے ہے جو انسان کی زندگی، اس کے گرد و پیش حالات و واقعات، اس کے نظام، اس کی فکر اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا سے بات کرتی ہے۔ جس قدر انسان کی زندگی وسیع ہے انسان کی تاریخ میں بھی اسی طرح وسعت ہے۔ اگر مختلف علوم کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ وہ واحد علم ہے جس میں ماضی کے واقعات، خیالات، جذبات، مشاہدات اور مواد کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ ماضی کے ساتھ انسان کا گہرا رشتہ ہے اگر

انسان کی تاریخ نہ ہو تو وہ اندر سے کھوکھلا اور بے جان ہو جائے تاریخ ہی کے ذریعے ایک خاص عہد کے اقدار، روایات اور مذہبی، سیاسی، معاشی اور فلسفیانہ افکار و نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ادبی تاریخ اپنے عہد کا آئینہ ہوتی ہے جس میں لکھنے والا اپنے عہد کی تہذیبی اور اجتماعی زندگی کا عکس دکھاتا ہے۔ادب اور تاریخ کا آپس میں گہرا تعلق ہے ادب میں پائے جانے والے سارے فکری، تہذیبی، معاشرتی عوامل تاریخ میں منعکس ہو کر ان سارے روایات، رجحانات اور تحریکات کا آئینہ دکھاتی ہے۔ کسی قوم کی بقا اور حیات میں تاریخ اہم کردار ادا کرتی ہے وہ بدلتے زمانوں کے ساتھ بدلتے نظریات و افکار سے آگاہ کرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ادبی فن پارے کو اس کے عہد کے رجحانات اور تہذیبی حالات کے تناظر سے دکھاتی ہے جس سے بعض اوقات نئے انکشافات اور نئے رجحانات بھی سامنے لاتی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ۔"اگر "ادب" زندگی کا آئینہ ہے تو ادب کی "تاریخ" کو بھی ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں ساری زندگی کی روح کا عکس نظر آئے۔"(۱۳)

تاریخ انسان کو ماضی کی معلومات پہنچانے کا ساتھ ساتھ قاری کے ذہن کو ایک نئی فکری سوچ سے آگاہ کرتی ہے۔حال ماضی کے ساتھ جڑا ہوتا ہے اور پھر اس سے مستقبل کی پیش گوئی کی جاتی ہے۔ موجودہ زندگی کی اقدار، رسم و رواج، نظریات و افکار ماضی کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اس طرح ان اقدار، اخلاقیات اور نظریات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔تاریخ ہی کے ذریعے یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ حال کا ماضی کے ساتھ کیا رشتہ ہے اور اسے کس طرح ماضی کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے حوالے سے عام طور پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں کہ اس کا مطالعہ کیوں ضروری ہے؟اس کی اہمیت کیا ہے؟ دیکھا جائے تو تاریخ ماضی کے حالات و واقعات کو قلمبند کر کے سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور تہذیبی واقعات کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ کسی بھی قوم کے فکر و احساس اور اور طرزِ زندگی کو ہمارے سامنے لاتی ہے اس کے علاوہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے نظریات، افکار اور خیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔تاریخ محض واقعات کا مجموعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اس عہد کا اجتماعی، سیاسی، مذہبی، تاریخی اور تہذیبی شعور بھی ملتا ہے۔تاریخ کے ذریعے ہم اپنے ماضی میں جھانک سکتے ہیں ان حالات و واقعات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جو ماضی میں بیت چکے ہیں۔تاریخ کو اگر زندگی سے نکال دیا جائے تو علوم و فنون کے جو تجربے کیے جا رہے ہیں وہ سب بیکار ہو جائیں۔ کیونکہ نئے علوم و فنون کا رشتہ ماضی کے ساتھ جڑا ہوتا ہے اور ایک نیا خیال ماضی کے تجربے سے ہی جنم لیتا ہے۔نئے علوم و فنون ماضی کی ارتقائی منازل کے بعد ہی ہم تک پہنچتے ہیں۔بقول ڈاکٹر صادق علی "اگر کسی قوم کی تاریخ گم ہو جائے تو وہ خود کو بے سہارا اور تنہا محسوس کرتی ہے۔"(۱۴)تاریخ میں تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہوئے ذاتی خیالات کے ساتھ ساتھ معاشرے کے رجحانات کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔تاریخ کے ذریعے ہی معاشرے کو وسیع النظر بنایا جا سکتا ہے اس کے ذریعے ہی قوموں

کی شکست اور فتوحات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے حوالے سے محبت یا نفرت کے جذبات پیدا کیے جاتے ہیں۔تاریخیت نہ تو سیاسی واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے اور نہ ہی بادشاہوں کے ادوار کو ترتیب وار بیان کرتی ہے بلکہ اس میں تاریخ، تہذیب و ثقافت، سیاست، مذہب، فلسفہ اور نفسیات کا جائزہ کسی خاص عہد کے تناظر میں لیا جاتا ہے۔

تاریخ کا ادب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔جس طرح انسان کا تاریخ کے ساتھ گہرا رشتہ ہے اسی طرح ادب کا تاریخ کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔اسی لیے جب انسان اور اس کی معاشرت کے حوالے سے بات کی جائے تو ادب میں اس کے ساتھ تاریخی تناظر میں بھی جانچا جاتا ہے۔ طین کے ہاں ادب کو جانچنے کے لیے تاریخی تناظر میں دیکھنا لازمی ہے۔وہ ادبی فن پارے کو سمجھنے کے لیے تاریخی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔اس نے تنقیدی اصولوں کو بیان کرتے ہوئے ادب اور تاریخ کو اہم گردانا۔اس نے اس بات پر زور دیا کہ کسی بھی تخلیقی فن پارے پر اس دور کے اخلاقی ،سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور مذہبی حالات کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اشرف کمال لکھتے ہیں:

> طین کے مطابق ادب تاریخ اور ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔کوئی بھی ادب جو اپنے عہد سے کٹا ہوا ہو قبولِ عام حاصل نہیں کر سکتا اور کسی بھی ادب کی تفہیم کے لیے اس دور کی ذہنی اور شعوری کیفیات کو سمجھنا ضروری ہے۔(۱۵)

ہر ادیب جو ادب تخلیق کرتا ہے وہ اس کے معاشرے اور زمانے کی پیداوار ہے کیونکہ وہ اسی معاشرے کا حصہ ہے۔اس کی تخلیقات میں اس کے معاشرے کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔وکو پہلا اطالوی فلسفی نقاد ہے جس نے تاریخ اور ادب کے آپس کے رشتے کی بات کی۔اس کا دور ۱۶۸۸ء تا ۱۷۴۴ء پر محیط ہے۔اس کے نزدیک تاریخ کے ہر دور میں ایک ایسا موڑ آتا ہے جہاں وہ سیاسی ،مذہبی، تہذیبی اور لسانی طور پر مختلف تبدیلیوں سے گزرتا ہے۔ مارکس کے یہاں بھی تاریخی تصور ملتا ہے لیکن وہ تاریخ کا مطالعہ اور تجزیہ غیر جانبداری سے کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا نتیجہ سائنسی طور پر اخذ کرنے کی بات کرتا ہے۔سوروکن اور ٹوائن بی بھی تاریخی فکر کا نظریہ وکو کے نظریے سے اخذ کرتے ہیں۔وکو کے علاوہ ہرڈر اور ییٹس نے ادب کو تاریخی تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے ادب کے مطالعے کو تاریخی تحریک میں بدلا۔ان کے نزدیک ادبی مؤرخ ماضی کی اقدار اور روایات کو سامنے رکھتے ہوئے عہد بہ عہد سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی محرکات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

تاریخ کو قدیم مگر تاریخیت کو نسبتاً نئی چیز کہا جاتا ہے۔انسان کی تاریخ ہزاروں برس پرانی ہے لیکن تاریخ کے عمل کو سمجھنے کا آغاز احیائے علوم کے دور میں ہوا اور مسلمانوں نے نویں صدی عیسوی میں اسے سمجھنے کی کوشش کی۔انیسویں صدی تک سائنسی اصولوں کے تحت ہی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا تھا انیسویں صدی میں ولھم ڈلتھے

(Wilhlem Dilthey)اور ہنرخ رکرٹ(Heinrich Ricket)نے تاریخ کو سائنس کے اصولوں سے تین وجوہات کی بنا پر الگ کیا۔ اوّل انسان اور مادے میں فرق ہے دنیا آفاقیت کی علمبردار ہے لیکن انسانی دنیا مسلسل تغیر پذیر ہے۔ دوّم مؤرخ ہر واقعے کو انفرادی سطح پر دیکھتا ہے۔ سوّم طبعی دنیا کو علت و معلول کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے لیکن انسانی دنیا کو ان قوانین کی روشنی میں پرکھنا مناسب نہیں۔[۱۶] اس طرح تاریخی اصول اور سائنسی اصولوں میں فرق وجود میں آیا اور ان اصولوں کو الگ الگ کر کے سمجھا جانے لگا۔ جرمن مفکرین نے اس بات پر خصوصی طور پر اس بات پر توجہ دی، تاریخی اور سائنسی علم میں فرق کیا اور انھیں الگ الگ سمجھنے پر زور دیا۔ ان کے نزدیک تاریخی علم میں صرف تاریخ کے واقعات ہی بیان نہیں کیے جاتے بلکہ جو واقعات رونما ہوئے انھیں تاریخی تناظر میں بھی جانچنا ہے۔ اس طرح تاریخیت کی تعریف میں بھی وسعت آئی اور یہ تمام سماجی و تہذیبی علوم پر غالب نظر آتی ہے۔ تاریخیت انگریزی میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں آئی اس کا مطلب "توضیح، تعبیر اور تعین قدر کا طریقہ" مراد لیا گیا۔ امریکہ میں مورس آر کوہن (Morns R Cohn)، اورس مینڈل بام (Maurrice Mandalbaum)اور برطانیہ میں ایف۔اے ہیل(F.A Hayal)اور کارل پاپر(Karl Popper) نے تاریخیت کی وضاحت کی۔ تاریخیت مارکسیت پر حاوی نظر آتی ہے جدیدیت کی بنیادوں پر چلنا اور روسی ہیئت پسندوں سے انحراف کو تاریخیت کے مطالعے کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ رومانیت اور روسی ہیئت پسندی کے ردِ عمل کے طور تاریخیت کے تصور کو استحکام ملا۔

اردو ادب میں تاریخیت کے موضوع پر جن اُدبا کے ہاں مباحث ملتے ہیں ان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریاض صدیقی، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر ناہید قمر، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر اشرف کمال، وہاب اشرفی، الطاف انجم اور قاسم یعقوب وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون "تاریخیت اور نئی تاریخیت: ادبی تھیوری کا ایک اہم مسئلہ" میں ادب اور تاریخ کے رشتے کے بارے میں بحث کی ہے اور ادب کو تاریخ کا زائیدہ قرار دیا۔ اس حوالے سے اُن کا کہنا ہے کہ ادب کا وہی مطالعہ صحیح ہے جو سماجی اور سیاسی تناظر میں کیا جائے۔ ریاض صدیقی ادب اور تنقید کا رشتہ تاریخیت سے جوڑتے ہوئے اپنے مضمون "اردو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت" میں کہتے ہیں۔ "ادب اور تنقید کا تاریخیت سے رجوع کرنا ایک فعال تعمیری رجحان ہے اور اس عالمگیر حقیقت پر دلیل کہ آرٹ اور ادب اپنے گرد و پیش سے الگ کوئی شے نہیں ہیں"۔[۱۷] پروفیسر عتیق اللہ نے تاریخیت پر جو مضامین لکھے ان کے عنوانات "تاریخیت و نو تاریخیت" اور "نو تاریخیت، اس کا پیش و پس" ہیں۔ یہ مضامین بالترتیب ڈاکٹر ندیم احمد کی کتاب ترقی پسندی ،جدیدیت اور ما بعد جدیدیت اور پروفیسر عتیق اللہ کی کتاب تعصبات میں شامل ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ کے مطابق جہاں تاریخ میں سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور تہذیبی قوتیں اہم ہیں وہاں عصری تصورات کو بھی بڑی اہمیت

حاصل ہیں اور یہ تاریخ پر نمایاں اثر ڈالتے ہیں یہ کسی نہ کسی صورت میں شعوری یالاشعوری سطح پر اور برائے راست یا ناراست طور پر ادبی تخلیق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کا مضمون ''نئی تاریخیت'' جو ان کی کتاب جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں) شامل ہے۔ اس میں نئی تاریخیت کے ساتھ ساتھ تاریخیت پر بھی بحث ملتی ہے۔ تاریخیت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''تاریخیت، تاریخ میں اترنے، تاریخ کو سمجھنے اور برتنے کا طریقہ ہے۔''(۱۸) تاریخیت میں کسی شے کی ماہیت اور اس کی قدر جاننے کے لیے اس کا تاریخی تناظر اور زمان و مکاں کے تناظر میں دیکھنا چاہیے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ زمانی و مکانی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ وہاب اشرفی کے مضمون ''مابعد جدیدیت :تاریخیت، نئی تاریخیت'' ان کی تصنیف مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات میں شامل ہے میں تاریخیت پر بحث ملتی ہے۔ ''نئی تاریخیت'' جو الطاف انجم کی کتاب اردو میں مابعد جدید تنقید سے لیا گیا۔ اس میں الطاف انجم نے نئی تاریخیت کے ساتھ تاریخیت کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔

لکھتے ہیں:

> تاریخیت نے ایک اہم نکتہ ابھارا ہے کہ تاریخی واقعات اپنے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی قوتوں کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ یہ طاقت کسی سیاسی یا مذہبی، معاشرتی یا اقتصادی آئیڈیالوجی کی مدد سے کسی شعبۂ علم پر حاوی ہو جاتی ہے جو آگے چل کر دیگر علوم و فنون کے اصول و ضوابط اور اقدار و ماہیت کے متعین کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔(۱۹)

ڈاکٹر اشرف کمال کی کتاب تنقیدی نظریات اور اصطلاحات میں تاریخیت پر جو مضمون ملتا ہے اس کا عنوان ''تاریخیت\نوتاریخیت'' ہے۔ ڈاکٹر اشرف کمال تاریخ کا رشتہ ادب سے جوڑتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انسان کا تاریخ کے ساتھ جس طرح گہرا رشتہ ہے اسی طرح ادب کا تاریخ کے ساتھ رشتہ ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ ادب روحِ عصر سے اپنا مواد لیتا ہے اور جب ادیب ادب تخلیق کرتا ہے تو اس میں اس زمانے مسائل اور رجحانات کی عکاسی ملتی ہے۔ کسی بھی دور کے ادب کے مطالعہ کے لیے اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کو مدِ نظر رکھا جائے۔

ڈاکٹر نسیم عباس احمر کی کتاب نوتاریخیت جس میں تاریخیت اور نوتاریخیت کے حوالے سے مضامین جمع کیے گیے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ میں تاریخیت اور نوتاریخیت پر مباحث ملتے ہیں اور دوسرے حصے میں اسی تناظر میں اس کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ تاریخیت کے حوالے کتاب اردو ادب میں تاریخیت ڈاکٹر ناہید قمر کی کتاب ہے جس میں "اردو ناول میں تاریخیت" کے نام سے ایک مضمون اور مختلف ناولوں کا تاریخیت

کے مطالعہ کیا گیا ہے۔تاریخیت کی تعریف ڈاکٹر ناہید قمر کچھ یوں کرتی ہیں تاریخیت میں متن کے مطالعہ کے دوران سماجی، سیاسی، تہذیبی اور تاریخی سطح پر آگہی اور عصری شعور کا ہونا ضروری ہے۔تاریخیت سے متعلق رویہ ہمیں جمیل جالبی کے یہاں بھی ملتا ہے، وہ ادب کا رشتہ ماضی سے جوڑتے ہیں ،ادبی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ حال ماضی سے جڑا ہے اور وقت کے بدلنے کے ساتھ تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ادبی تاریخ کے مطالعے کے دوران یہ راز کہ کس طرح تاریخ نظامِ اقدار اور تخلیقی عمل پر اثرانداز ہوتی ہے، عیاں ہوتا چلا جاتا ہے۔

ادیب اپنی تخلیق کے لیے مواد اپنی تاریخ اور تہذیب ہی سے اخذ کرتا ہے۔ادب اور تاریخ کا مدعا ایک ہی ہے دونوں ہی گزشتہ واقعات سے اپنا مواد اخذ کرتے ہیں۔تاریخ واقعات کو سادہ اور حقیقی انداز میں پیش کرتی ہے لیکن ادب میں انہی واقعات کو تخیلی انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور ان میں رنگینی کی فضا پائی جاتی ہے۔ادب میں ماضی کے واقعات کی پیش کش کے ذریعے گویا ایک طرح سے تاریخ کو محفوظ کرنا ہے۔تاریخیت میں تنقیدی معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے متن کو اس کے زمانۂ تخلیق میں رکھ کر پرکھا جاتا ہے۔

سید از ور عباس اور ڈاکٹر مطاہر شاہ اسی تناظر میں لکھتے ہیں:

> تاریخیت کی تنقیدی تھیوری کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کسی ادب پارے کی معیار بندی اس کے زمانۂ تخلیق کے تنقیدی معیارات کے مطابق کرتی ہے؛ جس سے فن پارے کی ادبی قدر و منزلت وہی متعین ہوتی ہے جس کا وہ حقدار ہوتا ہے۔[۲۰]

تاریخیت میں اس عہد کو خاص اہمیت دی جاتی ہے جس میں ادب تخلیق ہوا۔ادیب ادب تخلیق کرتے ہوئے جہاں تخیل، جذباتیت اور اور حواس سے کام لیتا ہے وہیں وہ اس دور کے مسائل و رجحانات کو بیان کرتا ہے۔مادام دی سٹیل نے ادب کو قومی مزاج کا عکس قرار دیا اور اس نے ادب پر جغرافیائی اور تہذیبی اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی۔[۲۱] ادب کی تخلیق میں جن تاریخی عناصر کو اہمیت دی جاتی ہے ان میں تاریخی، سیاسی، سماجی ،تہذیبی، مذہبی عناصر اہم ہیں۔

سیاسی عناصر میں ریاست اور ان سے متعلقہ علوم پر بحث کی جاتی ہے۔سیاست کا تعلق حکومت اور ان کے فرائض منصبی سے بحث کرنا ہے۔سیاسی تاریخ عام طور پر ریاستوں کی تشکیل، عروج، ترقی اور ان کے زوال سے بحث کرتی ہے۔سیاسی تاریخ میں حکومتوں کی تشکیل اور ان کے کردار پر بات کرنے کے ساتھ ساتھ ریاستوں کے آپس کے سیاسی اور اقتصادی تعلقات پر بھی بات کی جاتی ہے۔سیاسی تاریخ میں بین الاقوامی تعلقات پر بھی بحث کی جاتی ہے۔ مختلف ممالک کی سیاست سے متعلقہ معلومات اور مواد پر بحث کی جاتی ہے۔سیاسی تاریخ میں ملکی سیاست پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ پر سیاست کے اثرات ،سیاست میں رونما ہونے والے واقعات پر بحث کی جاتی ہے۔اس میں

ریاست کی اہمیت، افادیت اور مقاصد بیان کیے جاتے ہیں معاشرے کے مسائل پر بات کی جاتی ہے۔ سیاسی تاریخ میں ریاست اور حکومت کے اُصولوں پر بحث کی جاتی ہے۔ اس میں حکومت کی تنظیم اور اس کے ارتقا کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ ریاست قائم کرنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں مثلاً عوام کی فلاح و بہبود ،اقتدار کا حصول، مذہبی اقدار ،ذاتی مفاد اور جمہوریت کی حفاظت وغیرہ۔ ریاست کی تشکیل کے لیے قوانین، حکومتی نظام اور عدالتی نظام وغیرہ اہم ہیں جو ریاست کے نظام کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سیاسی تاریخ میں ان منابع اور ذرائع کو تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو معاشرے میں تبدیلیاں رونما کرنے کے ساتھ ساتھ زمانی انسلاک کا باعث بنتے ہیں۔ اس میں سیاسی پالیسیوں اور حکومتی اقدامات کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو معاشرے پر مثبت یا منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔

سماجی تاریخ ، سماج اور معاشرت سے متعلق ہے۔ معاشرتی حالات اور مسائل وغیرہ سے آگہی سماجی شعور کہلاتا ہے۔ سماجی تاریخ میں ایک معاشرے میں رہنے والے لوگوں کی طرزِ زندگی، اُن کے رسوم ورواج کا مطالعہ کیا جاتا ہے ایک سماج کے رہنے والے لوگوں کے دوسرے سماج کے رہنے والے لوگوں پر اثرات، سماج میں ہونے والی تبدیلیوں اور دوسرے سماج کے ساتھ اُن کا تقابل کیا جاتا ہے۔ سماجی تاریخ میں دیکھا جاتا ہے کہ ادب کا سماج کے ساتھ کیا رشتہ ہے اُس کے عصری مسائل، اقدارِ حیات، بدلتے ہوئے حالات اور اُن حالات کے پیچھے محرکات کیا تھے، ان کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ ادب کی تفہیم کے لیے سماج کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ کسی فن پارے کی قدر و قیمت کو جانچنے کے لیے اس کے سماج کا مطالعہ ضروری ہے۔ ادیب اپنی تخلیق میں اپنے جذبات کے بیان کے ساتھ ساتھ قاری کو اپنے معاشرے میں درپیش مسائل سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ ادب کی تخلیق میں ادیب کی شخصیت بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ادیب کا تعلق اپنے سماج سے ہوتا ہے اور اس کو وہ اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر محمد حسن اپنی کتاب ادبی سماجیات میں لکھتے ہیں:

> مختلف ادوار میں ادیبوں کی شخصیت، ان کے پیشے ،مشاغل اور طبقاتی کردار کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس میں ناصرف دلچسپ نتیجے نکل سکتے ہیں بلکہ ان کے موضوعات اور طرزِ بیان، ان کی علامتوں اور تمثالوں کے بارے میں نئی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں اور ہر دور میں شاعر اور ادیب کی بدلتی ہوئی تصویر اور اس کی شہرت اور مقبولیت کے مد و جزر کے مطالعے سے بھی بعض اہم حقائق سامنے آ سکتے ہیں۔ ان مطالعوں سے ادب کی تفہیم اور اس کی پرکھ کا ایک نیا پہلو تو سامنے آئے گا ہی، اس کے ساتھ ساتھ کسی دور کے سماج کی ذہنی اور جذباتی صحت یا عدم صحت کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ [۲۲]

ہر قوم کا اپنا تہذیبی تشخص ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسری قوموں سے الگ ہوتی ہیں۔ قوموں میں تہذیب کے بعض پہلو ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب ایک قوم کے لوگ دوسری جگہ جا کر آباد ہوتے ہیں تو کچھ ان کو دیتے ہیں اور کچھ ان سے لیتے ہیں اس کے علاوہ نو آبادیات کا تہذیب پر اثر ہوتا ہے لیکن اس سب کے باوجود ہر قوم کی تہذیب دوسری قوموں سے الگ اور منفرد ہوتی ہے۔ تہذیب سے مراد معاشرے کا رہن سہن، اُن کے نظریات، خیالات، فکر اور طرزِ زندگی ہے۔ جب کسی تہذیب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس میں قوموں کے رہن سہن، روایات، رسوم ورواج، طرزِ فکر، ادب اور فنونِ لطیفہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کسی بھی ادب پارے پر اس کی تہذیب کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔ ادب کے مطالعے کے دوران ادب پر تہذیبی اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ ادب کس طرح اپنی تہذیب سے متاثر ہوتا ہے، ادب پر تہذیب کے کیا اثرات ہیں، معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے ادب پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

مذہبی تاریخ میں مذہب کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ دنیا میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ کئی مذاہب نے جنم لیا اور اور کئی ختم بھی ہوئے۔ مذہب انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے، انسان کی سوچ اور فکر پر مذہب کا گہرا اثر ہوتا ہے اس کی مذہب کے ساتھ گہری وابستگی ہوتی ہے۔ ادب پر بھی مذہب کے گہرے اثرات ہیں۔ کسی بھی فن پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے کہ مذہب ادب کو کس طرح متاثر کرتا ہے، مذہب معاشرے پر کس طرح اثر انداز ہوا، معاشرے کی اخلاقی اقدار کیا ہیں۔ مذہب کی وجہ سے معاشرے کے رسم ورواج، اس کی اقدار اور اس کی اخلاقیات پر کیا اثر ہوا، ادیب اپنے معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ ان چیزوں کو محسوس کرتا ہے جو عام انسان نہیں کر سکتا۔ ادب میں وہ معاشرتی مسائل ورجحانات سے آگہی کے ساتھ ساتھ معاشرے پر مذہب کے اثرات اور اس سے ہونے والی تبدیلیوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

اُردو ادب میں سیاسی، مذہبی اور تہذیبی حالات وواقعات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ معاشی نظام پر بھی بحث کی جاتی ہے کہ معاشرے میں دولت کہاں سے آتی ہے، اُس کی تقسیم کس طرح کی جاتی ہے، ذرائع آمدن سے معیشت پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، معیشت کسی بھی معاشرے کا اہم حصہ ہے اس کے بھی انسان کے رہن سہن پر نمایاں اثرات ہوتے ہیں۔ معاشی تاریخ نویسی میں اقتصادیات کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ نیز یہ دیکھا جاتا ہے کہ اُردو ادب میں ان معاشی مسائل کو کس طرح اجاگر کیا گیا ہے، معاشیات کا ادب پر کیا اثر ہے وغیرہ کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

معاشرے میں ایک لمبے عرصے تک جمود رہنے کے بعد ایک نئی سوچ اور فکر جنم لے تو اس کو تحریک کا نام دیا جاتا ہے۔ تحریک ادب پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ تحریک معاشرے کو متاثر کرتی ہے اور ادب کا تعلق بھی معاشرے کے ساتھ ہے۔ چونکہ معاشرے، ادب اور تاریخ کا آپس میں گہرا رشتہ ہے اس لیے تحریک بھی

اس پر اثر انداز ہوتی ہے اور ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے کہ تحریک ادب کو کس طرح متاثر کرتی ہے۔ نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات تاریخ کا حصہ ہیں اور یہ بھی ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ جنگی تاریخ میں دنیا میں ہونے والی جنگ و جدل کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ سے طاقتور کمزور کو زیر کرنے کی کوشش کرتا آیا ہے۔ زمینوں کو ہتھیانے، جگہوں پر قبضہ کرنے، اقتدار کے حصول اور اپنے ملک و قوم کی حفاظت اور باہر کے خطرات سے نپٹنے کے لیے جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ تخلیق کار اپنی تخلیق میں جنگ کے اسباب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے پر جنگ کے جو اثرات نمودار ہوتے ہیں ان کو بھی بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر نائن الیون کے واقعات، تقسیم ہند اور جنگ عظیم اوّل اور جنگ عظیم دوم کو ادب میں موضوع بنایا گیا۔ ادب پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ جنگوں کے دوران ہونے والی تباہی نے معاشرے پر کیا اثرات مرتب کیے، ادب میں کیا تبدیلیاں آئیں ۔

ادب کا اپنے سماج کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور جب ادب میں تاریخ نویسی کی بات کی جاتی ہے تو ادب میں سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشی اور تہذیبی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ تاریخ میں وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ ارتقائی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں اسی طرح ادب کی تاریخ میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں، معاشرتی تبدیلیاں ادب کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ ادب کو کسی ایک شعبہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے مطالعہ کے دوران دیگر عوامل کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے جو ادب کو متاثر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> جب ہم کسی خاص ادبی دور کا تجزیہ کریں گے تو اپنا تجزیہ محض ادب کے شعبہ تک محدود نہیں رکھیں گے بلکہ ہم اس دور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیومالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات وغیرہ کی روشنی میں اس دور کا تجزیہ مکمل کریں گے۔ (۲۳)

ادبی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے محض واقعات کا جائزہ نہیں لیا جاتا بلکہ ادبی ذخائر کی جانچ پرکھ بھی کی جاتی ہے۔ محقق ماضی کے واقعات کے بیان کے ساتھ ماضی کے ذخائر کی دریافت بھی کرتا ہے اور ادب میں بیان واقعات کے اندر موجود حقائق کی صحت کے ساتھ وضاحت کرتا ہے۔

تاریخ کے عناصر کو مبارک علی نے یوں پیش کیا ہے:

> تاریخ نویسی میں تین عناصر کی اہمیت ہے؛ اوّل واقعات، دوسرے ان واقعات کی سچائی کو پرکھنے کے لیے شہادت اور پھر اس کے بارے میں مؤرخ کی تنقید تفسیر یا تاویل کیوں کہ محض واقعات کو سنہ وار بیان کرنے سے تاریخ کی اہمیت اجاگر نہیں ہوتی اور نہ ہی تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہ محض تاریخ کے بارے میں معلومات فراہم کر دینا ہے۔ اس لیے تاریخ نویسی میں اسباب، وجوہات اور نتائج کی نشان دہی ضروری ہے۔ (۲۴)

تاریخ میں صرف حالات و وقائع کا بیان نہیں کیا جاتا بلکہ تاریخ میں ربط اور تنظیم کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے تاکہ قاری کے ذہن میں نقش ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص ارتقائی ترتیب کے ساتھ واقعات کا بیان بھی سامنے آجائے۔ تاریخ میں کیا اور کیوں جیسے سوالات سامنے ابھرتے ہیں، اس وجہ سے ماضی کے واقعات کے پیچھے چھپے عوامل اور رجحانات کو سامنے لایا جاتا ہے۔ تاریخ میں جہاں فکر، خیالات، نظریات اور ادبی اقدار کی وضاحت کی جاتی ہے وہیں ادبی معیارات کو بھی پرکھا جاتا ہے۔ گیان چند جین کا کہنا ہے۔ ''ادبی تاریخ کو نہ محض سوانحات کا مجموعہ ہونا چاہیے، نہ تنقیدی مضامین کا اور نہ اسے سماجی تاریخ ہی بن جانا چاہیے۔ اسے ادب کا مسلسل ارتقا پیش کرنا ہے۔''(۲۵)

تاریخ لکھتے ہوئے یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، وقت کے ساتھ حالات و واقعات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ادب پر بھی یہ تبدیلیاں نمایاں اثر ڈالتی ہیں اس لیے ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے عصری آگہی ضروری ہے۔ ادبی فن پارے کے مطالعے کے دوران تاریخ، نظریات اور تہذیب و تمدن کے امتزاج کے ساتھ ادب پارے کا مطالعہ کیا جائے تو ادب کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ادب میں صرف ماضی کے واقعات کو سلسلہ وار بیان نہیں کیا جاتا بلکہ اس میں تاریخ کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ادب کے مطالعے کے لیے تاریخ کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ ادب میں جذبات و احساسات کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ادب کے مطالعے کے دوران تاریخ کو بیان کرتے ہوئے اس عہد کا سیاسی، سماجی، مذہبی، تہذیبی وغیرہ کے ساتھ ساتھ زمانی و مکانی تناظر میں جائزہ لینا چاہیے۔ ادب اپنی روایات اور اقدار کا پاسدار بھی ہوتا ہے، جب ہم ادب کا مطالعہ تاریخی تناظر میں کرتے ہیں تو معاشرے میں مختلف ادوار کی روایات اور اقدار کو بھی ذہن میں رکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عامر سہیل اور نسیم عباس احمر کا کہنا ہے:

> اب ادبی تاریخ محض کسی مخصوص دور کے زمانی حوالوں کو مربوط کرنے کا نام نہیں رہا۔ بلکہ ادبی تاریخ معاصر حالات و واقعات، مصنفین کے سوانحی خاکوں، ان کی تحریروں اور فن پاروں کو اس طرح Interpret کرتی ہے کہ سماجی تغیر و سماجی شعور، ثقافتی تنظیم متغیر جمالیاتی، ادبی و علمی اقدار، کسی تخلیق کار کے فن پارے میں تعبیری اور تجزیاتی سطحوں پر کس طور اثر انداز ہوئے۔(۲۶)

ماحول کا ادیب پر گہرا اثر ہوتا ہے اور ادب کی تخلیق کے لیے مواد وہ ماحول ہی سے اخذ کرتا ہے۔ ادب میں اپنی پوری قوم کی روح ملتی ہے، ادیب اپنے ارد گرد پر گہری نظر رکھتا ہے اور ادب تخلیق کرتا ہے۔ ادب کے مطالعہ کے لیے ادیب کی شخصیت، اس کے حالات زندگی اور معاشرت کو بھی سمجھنا ضروری ہے اور اس کے تناظر میں ہی اس کے

فن کا تجزیہ کیا جانا چاہیے۔ادیب کی شخصیت پر اس کی تہذیب اور اس دور کی رجحانات کا گہرا اثر ہوتا ہے اور اس کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔

تنقیدی نقوش میں ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:

> تاریخ ادب کا مطالعہ ذہنی، ادبی، تمدنی اور لسانی مطالعہ ہے۔اس طرح ادب کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے اور اس کا وسیع تصور اور تہذیبی اہمیت سامنے آسکتی ہے۔(۲۷)

ادب ماضی کی بازیافت ہے اس میں گزرے ہوئے زمانوں میں انسان، معاشرے، سیاست، مذہب، تہذیب اور ثقافت کی مختلف صورتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔تاریخ کو بیان کرتے ہوئے ایک اہم نکتہ معروضی ہے۔ادیب سیاست اور مذہب وغیرہ میں کسی خاص رجحان یا تحریک کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس حوالے سے مخصوص نقطہ نظر رکھتا ہے اور اس کا اثر اس کے تخلیقی ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ایک ہی دور میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے اس میں بھی ایک فن پارہ دوسرے فن پارے سے مختلف ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے سے الگ سوچ رکھتا ہے اور اپنے گردونواح کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور وہ کسی خاص رجحان یا تحریک سے متاثر ہوتا ہے جس کا اثر اس کی تخلیق میں بھی نظر آتا ہے چاہے وہ اثرات مثبت ہوں یا منفی۔ہر عہد کے اپنے سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی حالات یکساں ہونے کے باوجود تخلیقات میں فرق ادیب کی فکر اور سوچ میں فرق کی وجہ سے ہے۔

ادب میں واقعات اور حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ کسی خاص رجحان، نظریے اور تاریخ کے گم نام اور تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔تاریخ ماضی کے احوال و آثار، وقائع و حادثات کے اثرات و نتائج بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جغرافیائی، روحانی، سیاسی، معاشی، تعلیمی، ثقافتی، فن مصوری وغیرہ جیسے بنیادی عناصر کی وضاحت کرتی ہے۔تاریخ میں واقعات کے بیان میں معروضی ہونا اور غیر جانبداری سے فیصلہ کرنا مشکل کام ہے لیکن ادب کے مطالعے کے دوران غیر جانبداری سے کام لینا چاہیے۔

ادب میں ان تاریخی عناصر کو خاص اہمیت حاصل ہے، اگر ان عناصر کو نہ بیان کیا جائے تو ادب میں جھول پیدا ہو جائے۔ادب کا تعلق چونکہ انسانی زندگی سے ہے اس لیے جب ادب کو بیان کیا جاتا ہے تو تہذیب و ثقافت اور مذہب وغیرہ بھی اس کے لازمی جزو بنتے ہیں۔ادب زندگی کا پرتو ہوتا ہے اور ماضی سے حال اور مستقبل کے لیے رہنمائی لی جاتی ہے۔تاریخ اپنے علاقے کی پہچان ہوتی ہے ادب میں تاریخ کا بیان اس علاقے اور اس سے وابستہ قوم کی نمائندگی کرتی ہے۔اس سے کس بھی خطے کے اجتماعی شعور کے بارے میں آگہی ملتی ہے اس سے ملک و قوم کی ترقی و تنزلی کا اندازہ باآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

فصل دوم:

سفر نامہ؛ تعارف، روایت و فن

"سفر" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "مسافرت، یاترا اور سیاحت"(۲۸) کے ہیں اور "نامہ" فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "لکھا ہوا یا تحریر کی ہوئی عبارت" ہے۔ اردو میں سفر نامہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا جس کے معنی فرہنگ آصفیہ میں ا۔ سیاحت نامہ۔ ۲ سفر کی کیفیت ۳۔ روز نامچہ سفر ۴۔ حالات و سر گزشت سفر (۲۹) بیان ہوئے ہیں۔ سفر نامہ میں سفر کی روداد کو بیان کرنے کے ساتھ سفر میں پیش آنے والے حالات و واقعات اور اپنے تجربات و مشاہدات کو رقم کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود سفر نامے کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> سفر نامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفر نامہ ہے، سفر نامے کا تمام تر مواد مسافر کے گرد و پیش میں بکھرے ہوئے مناظر و واقعات سے اخذ کیا جاتا ہے۔(۳۰)

شہاب الدین لکھتے ہیں۔ "سفر نامہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں سفر نامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے مشاہدات و واقعات، تجربات اور قلبی تاثرات کو تحریر کرتا ہے۔"(۳۱) انسان کے اندر فطری طور پر یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ جمود اور یکسانیت سے اکتا جاتا ہے اور وہ آمادہ سفر رہتا ہے۔ سفر نامہ نگار سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات، مشاہدات، تجربات اور تاثرات کو بیان کرنے کے ساتھ وہاں کی تاریخی، تہذیبی اور جغرافیائی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ سفر نامے کو مختلف ناقدین نے مختلف طرح سے بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> سفر نامہ سفر کے تاثرات، حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ صنف ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔ اس صنف ادب کا تمام تر مواد موجود منظر کے گرد و پیش میں بکھرا ہوتا ہے لیکن واضح رہے کہ سفر نامہ نگار صرف خارجی ماحول کا مشاہدہ ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے بیانیہ

کو مدلل اور ہمہ جہت بنانے کے لیے بہت سی دوسری جزئیات کو سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار کی آنکھ جتنی باریک بین ہو گی اتنی ہی تفصیلات اُس کے مشاہدے میں آئیں گی۔ (۳۲)

دنیا کی ہر زبان کے ادب میں سفر ناموں یا سیاحت ناموں کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ ادب کی وہ صنف ہے جو معلومات پہنچانے کے ساتھ ساتھ بصیرت افروز ہے اور قاری کو تخلیقی ادب سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی فراہم کرتی ہے۔ اس سے قاری دنیا کی دیگر اقوام کے تہذیبی، جغرافیائی اور تمدنی حالات سے آگہی حاصل کر کے انسانی فطرت کی وسعتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ سفر نامے میں مشاہدات اور تحیر انگیز واقعات کا بیان ملتا ہے جو سفر نامے کو دلچسپ بناتا ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سفر نامے تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سفر نامہ ہر ادب کی ایک مستقل بیانیہ صنف ہے جس میں خارجی مشاہدے کو تخیل پر فوقیت حاصل ہے البتہ سفر سے متعلق ہونے کے باعث سفر نامے میں تحیر کا عنصر نمایاں تر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفر نامے کی پیش کش ادبی نوع کی ہو گی نہ کہ محض مسافر کا بیان۔ اس لیے کہ بامر مجبوری سفر اختیار کرنے والے ہر مسافر کا سفری احوال، ادب کی ایک مستقل صنف سفر نامہ یا سیاحت نامہ نہیں کہلائے گا۔ (۳۳)

ناقدین کے ان بیانات کا جائزہ لیتے ہوئے سفر نامے کی تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ سفر نامہ وہ صنف ادب ہے جس میں سفر کی روداد پیش کرتے ہوئے وہاں کے احوال و واقعات، مشاہدات، تجربات، محسوسات، اس جگہ کی تاریخی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور جغرافیائی اہمیت کو بیان کیا جاتا ہے۔

سفر نامے کا تعلق بیانیہ صنف سے ہے اس میں مصنف کسی ملک کے سیاسی، جغرافیائی اور تاریخی اہمیت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قلبی واردات اور خود پہ بیتے واقعات کو بیان کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار سفر کے دوران جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اس کو اپنے سفر نامے میں پیش کر دیتا ہے۔ سفر نامہ نگار خارجی حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ داخلی محسوسات و مشاہدات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ سفر نامے میں ادبیت کا خارجی عنصر ضروری ہے۔ سفر نامے میں زبان و بیان کا استعمال عمدہ ہونا چاہیے زبان کا استعمال سفر نامے کو دلچسپ بناتا ہے جس سے قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔

سفر اختیار کرنے کے مختلف اغراض و مقاصد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر حصول علم، بسلسلۂ روزگار، سیر و سیاحت یا زیارت کے لیے دور دراز کے علاقوں کا سفر اختیار کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ کسی ملک کی جدید و قدیم تہذیب سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے سیاسی، مذہبی اور تاریخی پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ سفر نامے کے ذریعے قاری کو

ایک نئی دنیا کی سیر کا موقع ملتا ہے،اس کے ذریعے وہ کسی ملک کی سیاست، معاشرت، تہذیب، زبان وادب اور مذہبی افکار و خیالات کا مطالعہ کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار صرف سیاحت ہی نہیں کرتا بلکہ دوسرے ممالک میں بسنے والی قوموں کے ساتھ اس کا رابطہ ہوتا ہے وہاں کے لوگوں سے میل جول ہوتا ہے تو ان قوموں کی سوچ ، نظریات ،افکار ،مصروفیات اور انداز و اطوار سے متعلق معلومات ملتی ہیں جس سے اسے وہاں کی تہذیب، ثقافت اور سیاست وغیرہ کی آگاہی کا موقع ملتا ہے۔ سفر نامہ میں سفر نامہ نگار تاریخی واقعات اور جغرافیائی تبدیلیوں کا جائزہ لیتا ہے ۔ان تبدیلیوں سے انسان اور اس کے ماحول پر مرتب ہونے والے اثرات کا مطالعہ کرتا ہے۔ سفر نامہ میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث ملتی ہے۔اس میں انسان کے ماحول اس کے گردونواح میں ہونے والی تبدیلیوں کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ دنیا میں ہر قوم کے عروج و زوال کے اس سلسلے نے انسانی زندگی کو متاثر کیا ہے سفر نامہ نگار اس کو اپنے سفر نامے میں اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ قاری خود کو انہی تبدیلیوں کے ساتھ سفر کرتا محسوس کرتا ہے۔

سفر نامہ لکھنے کا مقصد دوارن سفر پیش آنے والے واقعات اور اپنی محسوسات و مشاہدات سے قاری کو آگاہ کرنا ہے۔ پہلے جو سفر نامے لکھے جاتے تھے ان کا مقصد اس علاقے کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کی واضح کرنا اور ان علاقوں کی تاریخ، معاشرت، سیاست اور تہذیب کے بارے میں معلومات فراہم کرنا تھا۔ سفر نامے میں واقعات کو اس طرح سے بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس میں معلومات کے ساتھ ساتھ تحیر انگیز واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں اس سے سفر نامے میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور قاری اس سے حظ اٹھاتا ہے۔ سفر اختیار کرنے کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں اس لحاظ سے سفر نامے کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ سفر ناموں کی تقسیم مختلف حوالوں سے کی گئی ہے مثلاً موضوعات کے حوالے سے سیاسی سفر نامے، تاریخی سفر نامے، مذہبی سفر نامے اور سماجی سفر نامے وغیرہ لیکن سفر نامے کو موضوعات میں تقسیم کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا کیوں کہ ایک اچھے سفر نامے میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ سفر ناموں کی تقسیم تکنیک کے لحاظ سے بھی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر خط کی تکنیک، ڈائری کی تکنیک، روزنامچے کی تکنیک، بیانیہ یا خود کلامی کی تکنیک وغیرہ۔ مختلف ناقدین نے سفر نامے کی تقسیم مختلف حوالوں سے کی ہے۔ جیسے ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے سفر نامے کی چار اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ یورپ کے سفر نامے
۲۔ مشرقی سفر نامے
۳۔ مذہبی سفر نامے
۴۔ مقامی سفر نامے

ڈاکٹر شہاب الدین نے سفر نامے کی دو اقسام کا ذکر کیا ہے، عام سفر نامے اور مذہبی سفر نامے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سفر ناموں کی تقسیم کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

> سفر نامے کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً ایک قسم تو اس روایتی سفر نامے کی ہے جس میں سفر کرنے والا صرف ملک کا جغرافیہ بیان کرتا ہے۔ موسم کا حال، میدانی اور پہاڑی مناظر، آدابِ معاشرت، حاکم وقت کے خدوخال اور اگر بیسویں صدی کا سفر نامہ نگار ہے تو غسل خانوں اور ہوٹلوں کا حال، مشروبات کی قلت یا فراوانی اور ہر قسم کے شکار کی جملہ تفاصیل اپنے سفر نامہ میں سمیٹ لیتا ہے۔ دوسری قسم اس سفر نامہ کی ہے جس میں سفر نامہ نویس جغرافیہ کے بجائے صرف ملک کی تاریخ سے سروکار رکھتا ہے اور سنے سنائے قصوں کے اظہارِ مکرر میں لطف محسوس کرتا ہے۔ (۳۴)

دنیا میں سفر کرنے کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود نے ان اسفار کی اقسام کو یوں لکھا ہے۔ "مذہبی سفر، ادبی سفر، تعلیمی سفر، کاروباری سفر، سیاسی سفر، شاہی سفر، جنگی سفر، مہماتی سفر، تصوراتی و خیالات کا سفر، سفر ہجرت وغیرہ۔" (۳۵) سفر نامہ ایک غیر افسانوی صنف ادب ہے اس میں مواد، موضوع، اغراض و مقاصد اور محرکات کے حوالے سے متنوع صورتیں نظر آتی ہیں۔ اس میں انسانی زندگی کی رنگارنگ دلچسپیوں اور نفسیات سے آگہی کے ساتھ ساتھ علاقوں کے بارے میں معلومات اور تفاصیل بھی ملتی ہیں۔ سفر نامہ تحریر کرتے ہوئے حسن لطافت اور حسن بیان کے ساتھ اس کے افادی اور مقصدی پہلوؤں کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ سفر نامے کو عمومی طور پر درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

مذہبی مقاصد کے لیے جو اسفار اختیار کیے گئے اور اس حوالے سے جو سفر نامے لکھے گئے ان کو اردو ادب میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی ۔ ان میں زیادہ تر جو سفر نامے لکھے گئے ان میں حج بیت اللہ ، مکہ مکرمہ، مدینہ منوّرہ، عراق اور ایران میں موجود مقدس مقامات کے حوالے سے زیارتوں سے متعلق تفصیلات ملتی ہیں۔ ان سفر ناموں میں جہاں تحیر انگیز واقعات ملتے ہیں وہیں بیش بہا معلومات بھی ملتی ہیں جو نئے مسافروں کے لیے بطور رہنما کام آتی ہیں۔ ان سفر ناموں میں وہاں کی جغرافیائی اہمیت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تہذیبی صورتحال کو بیان کیا جاتا ہے۔ اردو میں مذہبی سفر ناموں میں سب سے زیادہ خزانہ حج ناموں کے حوالے سے موجود ہے۔ حج کی روداد اور حج کے لیے کیے گئے سفر پر مشتمل سفر ناموں کو حج ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حج کے لیے اختیار کیا گیا سفر اور عام سفر میں کافی فرق ہے حج کا سفر دیگر اسفار کی نسبت مذہبی لحاظ سے جذبات انگیز ہوتا ہے اور لوگوں کی اس سے وابستگی زیادہ ہوتی ہے۔ ان اسفار میں لوگ مادیت کو ترک کرتے ہوئے روحانیت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ حج ناموں میں حج نامہ نگاروں

کے طریقہ اظہار الگ الگ ہوتے ہیں بعض صرف قلبی احساسات و تاثرات کی وضاحت کرتے ہیں۔ بعض عازمین حج کی سہولت کے لیے مکہ مکرمہ اور مدینہ منوّرہ کے بارے میں تمام تفصیلات مثلاً جغرافیہ، تاریخ، آمد و رفت کے ذرائع، ایام حج کے دوران فرائض و واجبات اور مقامات مقدسہ کی زیارت وغیرہ سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے جو سفر نامے لکھے گئے اور جنھیں اردو ادب میں نمایاں مقام ملا، ان میں ممتاز مفتی کا سفر نامہ لبیک، خواجہ حسن نظامی کا مصر و شام و حجاز، بشریٰ رحمٰن کا باؤلی بھکارن، عبادت بریلوی کا دیارِ حبیب میں چند روز، غلام ثقلین رضوی کا ارضِ تمنا اور مستنصر حسین تارڑ کا منہ ول کعبے شریف اہم ہیں۔

سفر ناموں کی ایک اور قسم جس کا ذکر کیا جاتا ہے اس میں مشرق کے سفر پر مبنی سفر ناموں پر مباحث ملتے ہیں۔ ایران، ترکی، مصر، شام، چین، پاکستان اور عرب ممالک وغیرہ کے اسفار پر مشتمل سفر نامے مشرقی سفر ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں جہاں مشرقی تہذیب و تمدن، تاریخ اور معاشرت سے آگاہی ملتی ہے وہیں پر نو آبادیاتی نظام کے اثرات، نیز مختلف تہذیبوں کے اثرات اور ان کا موازنہ بھی ملتا ہے۔ مشرقی ممالک کے حوالے سے چند اہم سفر نامے شبلی نعمانی کا سفر نامہ روم و مصر و شام، مولانا محمد حسین آزاد کا سیرِ ایران، شیخ عبدالقادر کا مقامِ خلافت، خواجہ حسن نظامی کا سفر نامہ افغانستان، منشی محبوب عالم کا سفر نامہ بغداد چند اہم سفر نامے ہیں۔

مغربی ممالک کا شمار ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ وہاں لوگوں کا رجحان زیادہ تر تعلیم اور حصولِ روزگار کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کی سائنسی ترقی نے بھی انسان کو متاثر کیا اس لیے بھی لوگوں نے مغربی ممالک خاص طور پر یورپ اور امریکا کا سفر اختیار کیے اور وہاں کی تاریخ اور انسانی زندگی پر سائنسی زندگی کے اثرات کا تفصیلی احوال بیان کیا۔ انگریز ہندوستان پر ایک عرصے تک حکومت کرتے رہے جس سے ہندوستانی تہذیب دب گئی اور اس پر یورپی تہذیب و تمدن اور زبان کے اثرات نمایاں نظر آنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے اندر یورپی ممالک کی سیر کرنے کا جذبہ ابھرنے لگا اور دوسری طرف مشرق کی جو تہذیب دبنے لگی تھی اس کو متعارف کروانے کے لیے لوگوں نے یورپی ممالک کی سیر کی اور مشرقی تہذیب و تمدن کو وہاں متعارف کروایا۔ یہ بات باور کروانے کی کوشش کی گئی کہ کس طرح مغربی اقوام نے اپنی تہذیب کو زندہ کیا اور کس طرح ترقی کی منازل طے کر کے اپنا لوہا منوایا۔ مغربی سفر ناموں میں علم و فن، مغربی رہن سہن اور تہذیب و ثقافت، وہاں کے لوگوں کی محنت، ہنر اور جذبہ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اردو ادب میں یورپی ممالک کے سفر پر مشتمل پہلا سفر نامہ عجائباتِ فرنگ یوسف خان کمبل پوش نے لکھا پھر یہ روایت چل نکلی اور اس کے بعد کافی سفر نامے لکھے گئے۔ جن میں سر سید احمد خان کا مسافران لندن، خواجہ احمد عباس کا مسافر کی ڈائری، منشی محبوب عالم کا سیرِ یورپ، محمود نظامی کا سفر نامہ نظر

نامہ،اختر مومنکا کا پیرس ۲۰۵ کلو میٹر ،شورش کاشمیری کا یورپ میں چار ہفتے ،مرزا نثار علی بیگ کاسفر نامہ یورپ ،پروفیسر حمید احمد خان کا انگلستان کے کتے ،بیگم اختر ریاض الدین کا دھنک پر قدم، جمیل الدین عالی کے دنیا مرے آگے اور تماشا مرے آگے اور پطرس بخاری کاسفرِ انگلستان اہم ہیں۔یورپی ممالک کے سفر ناموں کے ساتھ ساتھ دیگر بیرونی ممالک حوالے سے جو سفر نامے لکھے گئے اور جنھوں نے اردو ادب میں نمایاں مقام پایا۔ان میں قراۃ العین کا جہانِ دگر ،عطاالحق قاسمی کا شوقِ آوارگی،ابن انشا کا چلتے ہو تو چین کو چلیے ،مجتبیٰ حسین کا جاپان چلو جاپان چلو ،گوپی چند نارنگ کاسفرِ آشنا وغیرہ ہیں۔

مقامی سفر ناموں میں وہ سفر نامے شامل ہیں جن کا تعلق اندرونِ ملک کے مختلف شہروں اور صوبوں سے ہے۔ان میں جن شہروں اور صوبوں کے سیاحتی مقامات کے بارے میں لکھا گیا ان میں پنجاب،سندھ،خیبر پختون خوا،بلوچستان،گلگت بلتستان،چترال اور ہنزہ وغیرہ شامل ہیں۔ان سفر ناموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں جہاں ان علاقوں کی خوبصورتی اور قدرت مناظر کو بیان کیا گیا ہے وہاں مقامی تہذیب و ثقافت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و سفر ہند کی تاریخ، تہذیب و ثقافت، طرزِ تعمیر، تعلیم اور سابقہ اور موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا ہے۔مقامی سفر ناموں میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے رتی گلی ، چترال داستان اور ہنزہ داستان،اعجاز حسین کاسفر نامہ بلوچستان،مختار مسعود کاسفر نصیب،اشفاق احمد کاسفر در سفر ،اور مبارک حسین عاجز کا کہساروں کی زمین میں چند روز وغیرہ کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ان سفر ناموں کو اگر تاریخ کا بھی ایک رخ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

سفر نامے کے بیان اور ان کے تراجم بھی ایک زبان سے دوسری زبان میں ہوتے رہتے ہیں۔اردو ادب میں بھی دیگر زبانوں کے سفر ناموں کو اردو زبان میں ڈھالا گیا اور یہ روایت خاصی قدیم ہے۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ جہاں دوسرے علاقوں کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ کے بارے میں آگہی ملی وہاں اردو ادب میں تکنیک اور اسلوب کے نت نئے تجربات کیے گئے اور اردو ادب کا دامن وسیع ہوا۔اردو ادب میں دیگر اصناف کے تراجم کے ساتھ ساتھ سفر ناموں کے تراجم بھی کیے گئے جس کی وجہ سے قارئین کے اندر سیاحت کا شوق ابھرا اور زندگی کے نشیب و فراز سے آشنا ہوئے۔اردو میں زیادہ تر جن سفر ناموں کے تراجم ہوئے ان میں انگریزی، عربی اور فارسی زبان کے سفر نامے شامل ہیں کیوں کہ برصغیر پاک و ہند کے لوگ عموماً ان تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔انگریزی زبان سے جن سفر ناموں کے اردو میں تراجم ہوئے ان میں ڈاکٹر برنیر کا روزنامچہ از ڈاکٹر برنیر مترجم، محمد حسین، سیرِ کشمیر از مسٹر ونٹریم مترجم کنہیالال کپور اور مارکو پولو کا سفر نامہ از مارکو پولو مترجم میر نجات علی وغیرہ کے نام اہم

TH-22781

ہیں۔فارسی اور عربی زبان کے اردو سفر نامے جن میں تاریخی روزنامچہ از عبد الطیف مترجم خلیق احمد نظامی،سفر نامہ یورپ از شاہ ناصر الدین مترجم مولوی عبد المجید فرخی،عجائب الاسفار از شیخ ابنِ بطوطہ اورسر زمینِ افغانستان میں از ابوالحسن ندوی وغیرہ کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

قدیم اور جدید سفر ناموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان میں فرق نمایاں نظر آتا ہے۔قدیم زمانے میں سفری سہولتوں کا فقدان ہونے کی وجہ سے لوگ محدود علاقوں تک کا سفر اختیار کرتے تھے۔اس لیے اس دور میں جو سفر نامے تخلیق ہوئے ان میں افکار وخیالات،تہذیبی،سیاسی،مذہبی اور معاشرتی معلومات اور انسان کا مشاہدہ اور اس کی سوچ حدبندیوں میں مقید نظر آتی ہے لیکن جدید سفر نامے میں مشاہدہ،اور وسعت کی گہرائیاں نظر آتی ہیں۔قدیم سفر نامے صرف تاریخی اور جغرافیائی معلومات تک محدود تھا۔جدید دور میں چونکہ سفر کی سہولیات ہر انسان کو میسر ہیں اس لیے آج کا انسان ان مسائل سے آزاد ہے جس کی وجہ سے جو سفر نامے اب تخلیق ہوئے ان میں تاریخی و جغرافیائی معلومات کے ساتھ ساتھ سیاسی،سماجی اور تہذیبی حالات وو اقائع سے بھی آگاہ کیا ہے۔پرانے زمانے میں جو لوگ بات سنتے اس کو ویسے ہی مان لیتے لیکن جدید زمانے کے لوگوں میں پہلے کی نسبت شعور بیدار ہو گیا ہے اور وہ تحقیق اور جانچ پرکھ سے کام لیتے ہیں لیے آج کے دور میں من گھڑت اور فرضی داستانوں پہ اتنا یقین نہیں کیا جاتا۔قدیم زمانے میں سفر کسی مقصد کے تحت ہی کیا جاتا ہے تھا اس لیے ادیب جب سفر نامہ لکھتا تو مقصدیت کی وجہ سے سفر نامے کی روح مجروح ہو جاتی تھی اور سفر نامہ صرف تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب بن کر رہ جاتی لیکن جدید سفر نامے میں افسانوی رنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے اور اس میں جہاں تاریخ،سیاست،تہذیب اور جغرافیہ کی وضاحت کی جاتی وہاں قلبی جذبات و احساسات کی بھی عکاسی ملتی ہے۔

اردو ادب میں اصناف کے فنی و تکنیکی مطالعہ کی روایت موجود ہے۔اصناف ادب میں فن اور تکنیک کے نت نئے تجربات کیے جاتے ہیں اور ان کے اصول وضوابط مقرر کیے جاتے ہیں جن کے تحت اس صنف کو پرکھا جاتا ہے۔سفر نامہ ایک بیانیہ صنف ہے اور اس کی ہیئت،تکنیک اور فن کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اس کے اصولوں اور فنی لوازم کا تعین کیا جاتا ہے۔سفر نامے میں اگر تکنیکوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سفر نامے میں تکنیک کے مختلف تجربات کیے گئے ہیں مثلاً خطوط کی تکنیک،ڈائری کی تکنیک،بیانیہ تکنیک،واحد متکلم کی تکنیک وغیرہ۔لیکن تاحال کسی ایک تکنیک پر ماہرین متفق نظر نہیں آتے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید یوں رقم طراز ہیں:

> تکنیک کے اعتبار سے سفر نامہ ایسی صنف اظہار ہے جس میں بہت زیادہ تجربوں کی گنجائش موجود نہیں۔ ابتدائی اور قدیم سفر نامے بیانیہ تکنیک میں پیش کیے گئے تھے۔آج کا جدید سفر نامہ بھی

اسی تکنیک میں لکھا جارہا ہے۔سفر نامہ چونکہ واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے،اس لیے اس میں فطری طور پر آپ بیتی کا انداز در آتا ہے،دلچسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے اور سفر نامہ نگار ہی ہیرو نظر آنے لگتا ہے۔سفر نامے کی تکنیک میں اہمیت اسی بات کو حاصل ہے کہ سفر نامہ کس وقت لکھا گیا اور سفر نامہ نگار نے اپنی یادداشتوں کو کیونکر محفوظ رکھا ہے۔(۳۶)

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سفر ناموں کی تکنیک پر کچھ اس طرح سے اظہار خیال کرتے ہیں:

خارج سے متعلق بیانیہ صنفِ ادب میں سفر نامہ سر فہرست ہے لیکن شاید سفر نامہ واحد نثری صنفِ اظہار ہے جس کی تکنیکی تعریف کا تعین تاحال ممکن نہ ہو سکا۔کچھ یہی سبب کہ سفر نامہ کبھی روزنامچے کے رنگ میں لکھا گیا اور کبھی خطوط کی شکل میں۔اس میں مکالمے کی شمولیت بھی ممکن ہے اور اس میں خبر پہنچانے کا انداز بھی کھپ جاتا ہے۔(۳۷)

جبکہ ڈاکٹر روبینہ پروین یوں رقمطراز ہیں:

سفر نامہ تکنیک کے اعتبار سے ایک ایسی صنف ہے جس میں دیگر اصناف کے اوصاف شامل ہوتے ہیں مثلاً ڈائری، روزنامچہ، خطوط، آپ بیتی، روزنامچہ، رپورتاژ، ناول کی تکنیک میں افسانوی رنگ شامل کرکے، حتیٰ کہ منظوم سفر نامے بھی تخلیق کیے گئے ہیں۔ابتدائی اور قدیم تمام سفر نامے بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔آج کے سفر نامے میں بیانیہ کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی حربے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔اردو کے قدیم سفر ناموں میں بالعموم یہ طریق کار رائج رہا ہے کہ سفر نامہ نگار بیشتر ایسی تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی، معاشرتی اور دیگر معلومات فراہم کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے جو دوسروں کو راستے کی مشکلوں سے بچانے کا کام دیں۔(۳۸)

کوئی بھی فن کار اپنی تخلیق کو دوسروں سے مختلف اور پر کشش بنانے، اپنے خیالات واحساسات کی ترجمانی اور اپنے تجربات و مشاہدات کو مؤثر بنانے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے یہی طریقے جو دورانِ تحریر بروئے کار لائے جاتے ہیں ان کو تکنیک کہا جاتا ہے۔اردو ادب کی ہر صنف میں تکنیک کے مختلف تجربات کیے جارہے ہیں اور ہر صنفِ ادب کے لیے تکنیک کو اہم مانا جاتا ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ سفر ناموں میں مختلف تکنیکوں کے تجربات کیے جا رہے ہیں۔قدیم سفر ناموں میں بیانیہ، خطوط، روزنامچے اور ڈائری کی تکنیک استعمال کی گئی لیکن اب جو سفر نامے لکھے جا رہے ہیں ان میں دیگر اصناف کی طرح فلیش بیک، مکالماتی انداز، آپ بیتی، رپورتاژ، تلازمِ خیال وغیرہ کی تکنیکوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔سفر نامہ کا تعلق غیر افسانوی ادب سے ہے اور اس میں بیانیہ کی تکنیک کا استعمال سب سے زیادہ ملتا ہے۔لیکن اس کے باوجود سفر نامہ کسی ایک تکنیک اور اصول کے تحت نہیں لکھا جا سکتا اس لیے سفر نامے میں دیگر اصناف کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔اردو کے قدیم اہم سفر ناموں میں جن میں ممالک کی تاریخ، تہذیب، جغرافیہ،

تجارت کا نظام، انتظامیہ کا طریق کار، عمارتوں کے نقشہ جات اور عدالتی نظام کو زیر بحث لایا گیا ان میں یوسف خان کمبل پوش کا عجائبات فرنگ ، سر سید احمد خان کا مسافر ان لندن، محمد حسین آزاد کا سیر ایران، شبلی نعمانی کا روم و مصر و شام وغیرہ شامل ہیں۔

عام طور پر سفر نامے دو طرح سے لکھے جاتے ہیں ایک دوران سفر اور دوسرے سفر ختم ہونے کے بعد۔ دورانِ سفر جو سفر نامے لکھے گئے ان میں زیادہ تر خطوط کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ایسے سفر نامے جو خطوط کی صورت میں لکھے جاتے ہیں ان میں ربط قائم رکھنے کے لیے اور ایک مربوط تحریر کی خوبیاں اجاگر کرنے کے لیے فنی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے اس کے بغیر خطوط میں بیان واقعات اور مناظر کی کڑیاں آپس میں ملانا اور دلچسپی کے عناصر پیدا کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ خطوط کا تعلق انسان کی نجی زندگی سے ہوتا ہے اس لیے اس تکنیک کے ذریعے زندگی کی حقیقتوں اور پیش آنے والے واقعات کو زیادہ بہتر صورت میں سامنے لایا جاسکتا ہے۔ خط کی تکنیک میں سیاح جو کچھ دیکھتا ہے اپنے جذبات واحساسات کو اسی شکل میں مکتوب الیہ تک منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے جیسے اس نے محسوس کیا ہوتا ہے۔ خطوط کی تکنیک میں لکھے گئے اہم سفر نامے ملک عبداللہ کا صوفیہ سے چند خطوط، عطیہ فیضی کا زمانہ تحصیل، نازلی رفیعہ سلطان کا سیر یورپ، شیخ عبدالقادر کا مقام خلافت اور عبدالغفار کا سیرِ دکن شامل ہیں۔

ڈائری کی تکنیک میں لکھا جانے والا سفر نامہ دورانِ سفر ہی تخلیق ہوتا ہے کیوں کہ سفر نامہ نگار سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات و حالات اور مشاہدات کو اپنی ڈائری میں ترتیب وار محفوظ کرتا جاتا ہے اور پھر بعد میں اس کو سفر نامے کی شکل دیتا ہے۔سید احتشام حسین کا سفر نامہ ساحل اور سمندر، محمد طفیل کا یورپ کا سفر نامہ ,صغریٰ ہمایوں بیگم کا روز نامچہ بھوپال وغیرہ ڈائری کی تکنیک میں لکھے ہوئے سفر نامے شمار ہوتے ہیں۔

سفر نامہ لکھنے کے لیے ایک عام اور مقبول تکنیک پسِ سفر کی تکنیک ہے اس تکنیک میں سفر نامہ نگار اپنی یاد شتوں کے بل بوتے پر سفر کے بعد اپنے سفر کو تحریری شکل دیتا ہے۔اس تکنیک میں عام طور پر تخیل کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ سفر ناموں میں اکثر چونکہ واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اس لیے سفر ناموں میں آپ بیتی کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں جس سے دلچسپی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔اردو ادب کا تحقیق و تنقید میں اصناف کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ ہیئت، اسلوب اور تکنیک فکری و فنی مطالعے کی روایت عام ہے جائزہ ہو یا فن و فکر کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ ہو اردو ادب کی اصناف کی ہیئت، تنقید اور اسلوب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اردو ادب میں سفر ناموں کا جائزہ لیا جائے تو قدیم سفر نامے زیادہ تر بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے۔ لیکن جدید سفر نامے میں تکنیک اور اسلوب کے تجربات ملتے ہیں اور ان میں

ایک تنوع اور وسعت ملتی ہے۔ سفر نامہ میں رپورتاژ کا رنگ بھی نمایاں ملتا ہے۔ رپورتاژ میں جنگ اور ہنگامی حالات کو رقم کیا جاتا ہے۔ رپورتاژ کی تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے سفر نامہ نگار جہاں حالات و واقعات کو بیان کرتا ہے وہیں احساسات و جذبات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ قدیم سفر ناموں کے ساتھ ساتھ جدید سفر ناموں میں بھی رپورتاژ کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ رپورتاژ کی تکنیک میں لکھے گئے سفر ناموں میں محمود نظامی کا سفر نامہ نظر نامہ، قدرت اللہ شہاب کا اے بنی اسرائیل، مختار مسعود کا لوح ایام اور فاروق عادل کا آنکھوں نے جو دیکھا وغیرہ شامل ہیں۔

ادب کی ہر صنف کی اپنی خصوصیات اور فنی لوازمات ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اس صنف ادب کو پرکھا جاتا ہے اسی طرح سفر نامہ بھی ادب کی ایک مقبول صنف ہے اور اس کے بھی فنی لوازمات ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اس کو پرکھا جاتا ہے۔ سفر نامہ کی مقبولیت میں گراں قدر اضافے کا سبب سفر نامے کے اصول اور فنی تقاضے ہیں۔ سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے میں ان فنی تقاضوں اور اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فنی لوازم کو برتتا ہے جس سے سفر نامہ دلکش اور جاندار بنتا ہے۔ سفر نامہ نگار سفر نامہ کے فنی لوازم کو جانے بغیر سفر نامے کا معیار قائم نہیں رکھ سکتا۔ اردو میں سفر نامے بہت تخلیق ہوئے لیکن سفر ناموں کے فن اور فنی لوازمات پر بہت کم بحث ملتی ہے۔ سفر نامے کو دلچسپ اور منفرد بنانے کے لیے سفر نامے کے بنیادی اصولوں اور شرائط پر عمل کرنا ضروری ہے۔

سفر نامہ نگار سفر کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات اور مناظر کا عینی شاہد ہوتا ہے اور وہ ان حالات و واقعات کو صفحہ پر ایسے ہی منتقل کرتا ہے اور قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے جیسا اس نے دیکھا ہوتا ہے۔ اس بات کے لیے سفر نامہ نگار کے ذہن میں تین عناصر جستجو، مشاہدہ اور تخیل ہونے چاہئیں۔ جس عہد میں سفر نامہ نگار سفر کرتا ہے اس وقت جو حالات نمایاں ہوتے ہیں ان کے پسِ پردہ کیا محرکات تھے ؟اس کو جاننے کی جستجو ہو تا کہ وہ حالات و واقعات کی اصل صورت سے قاری کو آگاہ کر سکے اور سفر نامہ پڑھتے ہوئے اس دور کے ساتھ سفر کرتا محسوس کر رہا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تخلیق کار کا مشاہدہ اتنا عمیق ہونا چاہیے تا کہ وہ ان حالات و واقعات کا گہرائی سے جائزہ لے سکے اور ان کی اصل صورت قاری کے سامنے پیش کر سکے۔ جستجو اور مشاہدہ کے ساتھ ایک اور جو اہم چیز وہ تخیل ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنے سفر نامے کو دلچسپ اور منفرد بناتا ہے۔ اس کی بدولت ہی قاری ایک نئی خوبصورت دنیا کی سیر کرتا ہے اور سفر نامے کے ادبی حسن میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

سفر نامے میں حالات و واقعات کے بیان میں سچائی کا عنصر بھی اہم ہے۔ سفر نامہ نگار کا اندازِ بیان ایسا ہونا چاہیے جس میں حالات و وقائع کے بیان میں سچائی کا عنصر بھی نمایاں ہو اس کے ساتھ ساتھ تخلیقی بصیرت، زبردست

قوتِ مشاہدہ مؤثر اندازِ تحریر ہو۔ سفر نامہ لکھنے کے لیے عمیق مشاہدے کے ساتھ ساتھ مصنف کی فکر انگیزی، موضوعات کا انتخاب، واقعات اور مناظر کے بیان کی ترتیب اہم ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید رقم طراز ہیں:

> سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں مشاہدے کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے۔ یہ صنف علم تاریخ اور علم جغرافیہ کے فنی مقاصد کے لیے میکانیکی کے انداز مین کوائف جمع نہیں کرتی بلکہ ایک مربوط، دلچسپ اور خوشگوار بیانیہ مرتب کرنے کے لیے ان سب سے فائدہ ضرور اٹھاتی ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی کے اس مشاہدہ کو سفر نامے میں یوں منتقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی روح کا تحرک محسوس کر لیتا ہے اور اس میں مکمل کامیابی اس وقت ہوتی ہے جب سفر نامہ نگار ادب کے جملہ تقاضوں سے بخوبی واقف ہو اور مشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی قوت رکھتا ہو۔ (۳۹)

سفر نامے میں انداز بیاں ایسا ہو کہ زبان روز مرہ کے قریب ہو نیز عام فہم ہو اور مناسب الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ الفاظ کا چناؤ موقع و محل اور موضوع کے اعتبار سے درست ہو۔ نثر سلیس اور شستہ ہو۔ مصنف کو چاہیے کہ داخلی اور خارجی حقائق و واقعات کو بیان کرتے ہوئے شگفتہ اور سلیس انداز اختیار کرے۔ زمان و مکان اور تاریخی حقائق کو بیان کرتے ہوئے شگفتہ انداز اپنائے اور تمام جزئیات کو اس طرح بیان کرنے کی کوشش کرے کہ قاری معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سفر نامے کی لطافت سے بھی حظ اٹھائے۔ بقول انور سدید ''سفر نامہ نگار جن جزئیات کو جمع کرتا ہے ان سب کا شگفتہ تذکرہ قاری کو اہتزاز سے ہمکنار کرتا ہے۔''(۴۰) سفر نامے میں شگفتہ انداز تحری اختیار کیا جانا چاہیے لیکن اس میں طنز و مزاح کی زیادہ گنجائش موجود نہیں۔ سفر نامے میں بھاری بھر کم الفاظ کا استعمال عبارت کو ثقیل بنا دیتا اس کے علاوہ مبالغہ آرائی کے استعمال سے بچنا چاہیے۔

اس ضمن میں خالد محمود یوں رقم طراز ہیں:

> سفر نامہ نگار، سفر نامے کے مطالبات کو اپنے مخصوص طرزِ نگارش کے مطابق ڈھال لیتا ہے، گویا سفر نامہ نگار آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنے تجرباتِ سفر تحریر کرے مگر یہ خیال ضرور رہے کہ سفر نامے کو سفر نامہ ہی رہنے دے داستان، ناول یا افسانہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔ سفر نامہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے خواہ مخواہ کی رنگین بیانی، افسانویت، مبالغہ آرائی، پر اسرار بنانے کی کاوش یا بے موقع لطائف وغیرہ سفر نامے کی روح کو مجروح کر دیتے ہیں اور ایسا سفر نامہ نامعتبر خیال کیا جاتا ہے۔ (۴۱)

سفر نامے کا تعلق غیر افسانوی ادب سے ہے ۔ سفر نامے میں جہاں خارجی حقائق (تاریخ، تہذیب ،مذہبی ،سیاسی اور سماجی حالات) کو بیان کیا جاتا ہے وہاں داخلی عناصر (احساسات ، جذبات اور مشاہدات) کو شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ سفر نامے میں منظر نگاری، جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کے بیان کے ساتھ زبان کا عمدہ استعمال بھی اہم ہے۔ سفر نامے میں تاریخی اور جغرافیائی حالات کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں جو سفر نامے لکھے گئے ان میں تاریخ اور جغرافیہ کو ہی تفصیل سے بیان کیا جاتا تھا۔ اس دور میں لکھے گئے سفر ناموں میں تاریخ اور جغرافیہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی کیوں کہ سفر نامہ نگار کا مقصد اس علاقے کی تاریخی اہمیت بتانا اور ان علاقوں کے دشوار گزار راستوں اور موسم و حالات کے حوالے سے معلومات پہنچانا تھی۔ لیکن جدید سفر نامے میں اب کافی تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں مگر تاریخی اور جغرافیائی لوازمات کو اب بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ سفر نامے میں تاریخی و جغرافیہ کے بیان سے قارئین کو تاریخی و جغرافیائی حالات سے شناسائی کی بدولت سفر نامے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

سفر نامے میں تہذیبی و ثقافتی حالات کے بیان کے بغیر سفر نامہ نامکمل سمجھا جاتا ہے۔ ہر علاقے کی اپنی تہذیب اور ثقافت ہوتی ہے جو اسے دوسری قوموں سے ممیّز کرتی ہے اور بین الاقوامی شہرت کے حامل ٹھہراتی ہے۔ سفر نامے میں سفر نامہ نگار اس علاقے کے رہن سہن، رسوم و رواج، ان کی روایات اور اقدار پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ سفر نامے میں تاریخی، سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں تک پہنچ کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے سفر نامے میں پیش کرتا ہے۔ وہ شہروں ، قصبوں ، ریاستوں جغرافیائی محل وقوع تاریخی حقائق کے ساتھ پیش کرتا ہے ، وہاں کے حکما، علماء، شعراء اور صوفیاء کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ طرزِ حکومت عدلیہ کا انتظام ،قدیم عمارتوں کے احوال و آثار ، مساجد ، تعلیمی ادارے ، ہسپتال ، درآمدات اور برآمدات ، سیر گاہیں ، ملک کے تحفظات کے انتظامات ، بازاروں کے احوال ، تاجروں اور دکانداروں کا طرزِ گفتگو ، زراعت اور صنعتوں کا نظام جنگلات ، سمندر ، عالمی آفات ، قوموں کے خصائص کی جزئیات کو بڑی چابکدستی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

سفر نامہ نگار مناظر کی تصویر کشی نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اصل منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ منظر نگاری اردو سفر نامے کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ سفر نامے میں جان پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مصنف مناظر کی اس طرح تصویر کشی کرے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جائے اور قاری وہی محسوس کرے جن احساسات و جذبات سے سفر نامہ خود دوچار ہوا۔ سفر نامے میں جس قدر حقیقت نگاری اور منظر کشی سے کام لیا جائے گا اسی قدر سفر نامہ دلچسپ اور کامیاب ہوگا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی کا کہنا ہے ''سفر

نامے کی بنیادی خصوصیت یہ ہے اس کی نثر دلکش ہو، مشاہدہ گہرا ہو، مصنف جس لطف سے سرشار ہے قاری کو اس میں برابر کا شریک کرے، مصنف کے ساتھ قاری بھی سیر کرنے لگے۔"(۴۲)

اردو ادب کی کوئی بھی صنف ہو اس میں اعتدال اور توازن لازمی جزو ہے۔ سفر نامے میں اگر واقعات، احساسات اور تاریخی حوالوں کے بیان میں اعتدال و توازن کو برقرار نہ رکھا جائے تو یہ تاریخ و جغرافیہ کی کتاب بن جائے گی، جغرافیائی معلومات کا بیان اسی قدر کیا جائے کہ محل وقوع جاننے میں مددگار ہو ورنہ سفر نامہ نگار جغرافیہ دان کی طرح محض ٹھوس حقائق کو تفصیل سے بیان کرتے کرتے سفر نامے کو بے مزہ کر دے گا۔ سفر نامہ لکھتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تاکہ سفر نامے کا حسن اور معیار برقرار رہے۔

کسی بھی نثر پارے میں دلچسپی بڑھانے کے لیے اس میں تحیر اور تجسس کے عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان عناصر کی عدم موجودگی میں فن پارہ خشک، بے کیف اور دلچسپی سے خالی ہونے کی بنا پر اپنا تاثر کھو بیٹھتا ہے۔ معیاری اور اچھے سفر نامے کے لیے ضروری ہے کہ سفر نامہ نگار قاری کے دلچسپی کے عناصر کو ہر وقت مدِ نظر رکھے۔ واقعات کے بیان، ان کی پیشکش اور نئے انکشافات میں جذبہ تجسس اور تحیر کے عناصر کو ابھارا جائے تاکہ دلچسپی کا عنصر بڑھے اور قاری سفر نامے کی طرف متوجہ رہے۔

سفر نامہ نگار کو حقائق کی پیشکش اور حالات و وقائع کے بیان میں غیر جانبدارنہ اور منصفانہ رویہ اپنانا چاہیے۔ سفر نامہ نگار جہاں جہاں جاتا ہے اور جن علاقوں کا سفر کرتا ہے اس پر اپنا بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار کو چاہیے کہ کسی علاقے، ملک یا شہر کے حالات و واقعات، رسم و رواج، طرزِ زندگی، سیاسی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی حالات و واقعات کو بیان کرتے ہوئے توڑ مروڑ کر پیش نہ کرے بلکہ غیر جانبداری سے سچائی اور حقیقت کو سامنے لائے۔ غیر ضروری اور نامناسب الفاظ اور حقائق کو تروڑ مروڑ کر پیش کرنے سے اجتناب کرے۔ ایک اچھے سفر نامہ نگار میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ حقائق کو بیان کرتے ہوئے منصفانہ رویہ برتتا ہے۔

سفر نامے میں جہاں احساسات و جذبات کی ترجمانی ملتی ہے وہیں خارجی واقعات اور معاشرتی و سماجی حالات کا بیان بھی ملتا ہے۔ سفر نامے میں خارجی واقعات کی تصویر کشی چشم باطن سے کی جاتی ہے اور مشاہدے کی آنکھ سے دلکش مناظر اور حیرت انگیز واقعات کو ایک خوبصورت پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔ سفر نامے میں ہمیں تاریخ، تہذیب، فکر، سماج، سیاست اور مذہب کا مطالعہ ملتا ہے۔ سفر نامے میں ادب کی روح کو مجروح کیے بغیر حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے جو کہ ایک دلچسپ عنصر ہے جذبات و احساسات کی بھی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ سفر نامے میں جہاں زندگی کے وسیع، عمیق اور متنوع مناظر کو دیکھتے ہیں وہیں زندگی کو دیکھنے، اس کو سمجھنے اور نئے امکانات سے آشنا ہونے کے ساتھ فکر و نظر کی وسعتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔

سفر ناموں کی ابتدا کا ذکر کیا جائے تو سفر ناموں کی ابتدائی صورت ہمیں داستانوں میں ملتی ہے۔ پہلے زمانے میں جب لوگ دوسرے علاقوں کا سفر کر کے آتے تھے تو وہ دوسرے لوگوں کو اپنے احوال اور سفر کے حالات و واقعات اور تاثرات کو داستان کی صورت میں بیان کرتے تھے یوں یہ واقعات دوسرے لوگوں اور علاقوں تک پہنچ جاتے تھے۔ لیکن اس میں دوسرے لوگوں تک کچھ واقعات اپنی اصلی حالت میں پہنچتے تھے جبکہ ان میں سے بعض واقعات کی حقیقت مسخ ہو جاتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ لوگوں میں لکھنے کا شوق بیدار ہوا اور سفر نامے ڈائریوں اور روز نامچوں کی صورت میں لکھے جانے لگے۔ اس کے بعد کچھ سفر نامے رہنمائی کے لیے بھی لکھے گئے۔ ان سفر ناموں میں خاص بات یہ ہے کہ یہ سفری معلومات کے لیے گائیڈ بکس کے طور پر کام آنے لگے۔ اس میں راستوں اور سمتوں کی نشاندہی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور حادثات اور ان سے بچاؤ کے طریقے بھی درج ہوتے تھے۔

اردو میں سفر نامے کا آغاز انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہوا۔ اردو ادب میں جسے سب سے پہلا سفر نامہ قرار دیا جاتا ہے وہ یوسف خان کمبل پوش کا عجائبات فرنگ ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۴۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس دور میں یہ سفر نامہ لکھا گیا اس دور میں سفر نامہ نے اپنی کوئی خاص صورت اختیار نہیں کی تھی اس لیے موجودہ دور میں اس سفر نامے کو اولین مانتے ہوئے اس پر کافی تحقیقی و تنقیدی کام کیا جا چکا ہے۔

تحسین فراقی کا کہنا ہے:

> اردو میں سیاحت نگاری کی تاریخ ڈیڑھ سو سال سے کسی صورت زیادہ نہیں بنتی۔ کمبل پوش کی "تاریخ یوسفی" یا "عجائبات فرنگ" اردو کا پہلا سفر نامہ ہی نہیں، سفر نامے کا اہم ترین سنگ میل بھی ہے اور اس پر جدید سفر نامے کی اصطلاح کا اطلاق بھی بہت حد تک ہوتا ہے۔ (۴۳)

سفر نامے کی صنف پر تحقیق کے مطابق یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے کے بعد سید فدا حسین عرف نبی بخش کا سفر نامہ تاریخِ افغانستان ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا۔ تاریخ افغانستان کے بعد جو سفر نامہ منظرِ عام پر آیا وہ بھی یوسف خان کمبل پوش کا سیرِ ملک اودھ ہے جس کی تدوین ڈاکٹر نجیبہ عارف نے کی ہے۔ اس کے علاوہ جو سفر نامے لکھے گئے مولانا جعفر علی تھانیسری کا کالا پانی ہے۔ اس کا دور ۱۹۶۶ء کا ہے اس کو آپ بیتی بھی کہا جاتا ہے۔ ابتدا کے سفر ناموں میں جن سفر ناموں کو اہمیت حاصل ہوئی ان میں محمد حسین آزاد کا سیرِ ایران، مولوی عبدالخالق موحد کا سیرِ برہما، مولانا شبلی نعمانی کا سفر نامہ روم و مصر و شام، منشی آدم خان کا سیاحتِ امیری یعنی حالاتِ سفرِ ہندوستان، ڈاکٹر محمد حسین کا ۱۹۰۷ء کا جاپان، منشی محبوب عالم کا سفر نامہ بغداد، خواجہ غلام ثقلین کا روز نامچہ سیاحت، نواب حامد علی خان کا سیرِ حامدی اور مولانا سید حسین مدنی کا

اسیرانِ مالٹا، خواجہ حسن نظامی کا سفر نامہ افغانستان، سید سلیمان ندوی کا سیرِ افغانستان، اے حمید کا رنگون سے فرار ہیں۔

موجودہ دور کے سفر نامہ نگار جن کے سفر نامے اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جن میں تاریخی عناصر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اس نوعیت کے سفر ناموں میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ترکی میں دو سال، کرنل محمد خان کے بجنگ آمد اور بسلامت روی، ابن انشا کے سفر نامے چلتے ہو تو چین کو چلیے، آوارہ گرد کی ڈائری ، دنیا گول ہے، ابن بطوطہ کے تعاقب میں اور نگری نگری پھرا مسافر، مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے سفر نامہ نیپال نگری، راکا پوشی ،دیو سائی ،سنو لیک، نکلے تیری تلاش میں، اندلس میں اجنبی، منہ ول کعبہ شریف اور غارِ حرا میں ایک رات ، ممتاز مفتی کے سفر نامے لبیک اور ہند یاترا، محمد سعید حاکم کے سفر نامے ماہ روز ،ایک مسافر چار ملک ، یہ ہے ترکی، محمد اختر مومنکا کا سفر نامہ سفر تین درویشوں کا، امجد اسلام امجد کے سفر نامے شہر در شہر ، ریشم ریشم اور چلو جاپان چلتے ہیں، انور راجا کا ہمالہ کے اس پار، اے بی اشرف کا ذوق دشت نوردی اہم ہیں۔

اردو ادب میں جو سفر نامے تخلیق کیے گئے وہ مختلف مقاصد کے تحت لکھے گئے مثلاً کسی کا مقصد صرف سفر کے دوران کے احوال پیش کرنا ہے کسی کا مقصد وہاں کی تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے معلومات فراہم کرتا ہے۔ چونکہ سفر اختیار کرنے کے کئی مقاصد ہیں جیسے مقدس مقامات بیان ہے۔ فرخ سہیل گوئندی کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے انھیں بچپن ہی سے سیر و سیاحت اور جہاں گردی کا شوق تھا اس کے لیے انھوں نے مختلف ممالک کے سفر اختیار کیے اور پھر ان اسفار کو سفر نامے کی صورت میں پیش کیا۔ فرخ سہیل گوئندی ادیب، دانش ور اور سیاسی عملیت کار (political activist) کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ فرخ سہیل گوئندی ۲۳ اگست ۱۹۶۰ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد یعقوب گوئندی ایک کاروباری آدمی تھے اور پرفیوم کا کاروبار کرتے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ گوئندی لکھنے کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کے خاندان کا تعلق سیالکوٹ کے مسلمان گوئندی قبیلہ سے تھا جو سیالکوٹ کے ایک گاؤں متراں والی میں آباد تھا۔ اس وقت تین گاؤں جو گوئندی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ان میں سے ایک مسلمان گوئندیوں کا گاؤں متراں والی دوسرا پن باجوہ سکھ گوئندیوں کا اور تیسرا گاؤں بہلول پور ہندو گوئندیوں کا تھا۔ سرگودھا میں جب لوئر جہلم بنی برطانوی حکومت نے اس کو آباد کرنے کے لیے زمینیں تفویض کی اور خوش قسمتی سے فرخ صاحب کے خاندان کا نام بھی یہاں کی زمین کے لیے نامزد ہوا اور ان کا خاندان یہاں (سرگودھا) آبسا اور شروع میں انھوں نے کاشت کاری کا پیشہ اختیار کیا اور بعد میں وہ تجارت کے ساتھ منسلک ہو گئے۔

فرخ سہیل گوئندی نے ابتدائی تعلیم سرگودھا سے حاصل کی، میٹرک کینٹ پبلک سکول موجودہ ایف جی سکول سرگودھا سے پاس کیا۔اس کے بعد آپ نے ایف اے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے کیا اس وقت اس کالج کے پرنسپل ادیب، شاعر اور دانشور غلام جیلانی اصغر تھے۔بی۔اے آپ نے پرائیویٹ کیا کیوں کہ اس وقت ملک حالات انتہائی ناسازگار اور ناموافق تھے۔اس وقت جنرل ضیاالحق کا دور تھا اور اس دور میں پیپلز پارٹی کے چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی اور آپ کی وابستگی پیپلز پارٹی کے ساتھ تھی اور اس کے ساتھ آپ سوشل ایکٹوسٹ بھی تھے اس کا اثر آپ کے تعلیمی سفر پر بھی پڑا۔پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے پولیٹیکل سائنس میں کرنے کے کافی عرصہ بعد ایک شارٹ کورس پیس سٹڈیز کنفلکٹ ریزولیشنز (piece studies conflict resolutions) امریکہ سے سکالر شپ پر کیا پھر اسی ادارے سے آپ نے ایم فل پیس بلڈ نگ لیڈر شپ کنفلکٹ ریزولیشنز میں کیا اور اس میں آپ کا عنوان "بوسنیا" تھا۔بہت سی کانفرنسز اور شارٹ کورسز کے علاوہ آپ نے یونائٹڈ نیشنز کا انٹر نیشنل لیڈر شپ ٹریننگ پروگرام کا چھ ہفتوں کا کورس کیا جو کہ خاصی اہمیت کا حامل تھا۔فرخ سہیل گوئندی سیاسی طور پر محرک ہیں ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت سے بہت متاثر تھے انھوں نے قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ خود ساختہ جلاوطنی بھی کاٹی۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی سیاست میں گزاری۔سیاسی و سماجی حوالے سے انھوں نے کئی کتب تحریر کیں۔ان کی اہم کتب میرا لہو :ذوالفقار علی بھٹو،سیاست و شہادت۱۹۸۶ء،پنجاب کا مسئلہ۱۹۸۸ء،چوتھا مارشل لا۱۹۸۹ء، بھٹو کا قتل کیسے ہوا۲۰۱۱ء، سرمائے کا آقا:عالمی بینک کاری کی دہشت گردی۲۰۱۱ء، ترکی ہی ترکی۲۰۱۴ء، بکھرتا سماج۲۰۱۶ءاور لوگ درلوگ ۲۰۱۹ءہیں۔ان کا جھکاؤ ترقی پسند نظریات کی طرف ملتا ہے۔انھوں نے صحافت میں بھی قدم رکھا اور کالم نویسی کی طرف راغب ہوئے اس کے ساتھ ساتھ کامیاب اینکر بھی رہے اور کئی ٹی وی چینلز پر کام کیا۔انھوں نے اپنے کالموں کو یکجا کر کے اس کو کتابی شکل بکھرتا سماج کی صورت میں شائع کروایا۔

فرخ سہیل گوئندی نے سیاست کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی لکھا۔ان کے ہاں ادبی ذوق نمایاں ہے۔ان کی تحریروں میں تہذیب و ثقافت،روایات اور مذہب کی عکاسی پائی جاتی ہے اس حوالے سے ان کی ایک اہم کتاب بکھرتا سماج ہے جو ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔فرخ سہیل گوئندی نے ترکی میں بہت وقت گزارا اور وہ خالص ترکی کے عاشق کہلاتے ہیں۔اب تک وہ پچاس سے زیادہ چکر ترکی کے لگا چکے ہیں ترکی میں زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے انھوں نے ترکی پر کتب لکھیں اور اس میں ترکی کی تہذیب و ثقافت اور سیاست کو بیان کیا ہے۔ترکی میں زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ترکی کی روایات ورجحانات وغیرہ کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔اس حوالے سے ان کی اہم کتاب ترکی ہی ترکی جو ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آئی اور سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد ۲۰۲۱ء میں شائع

ہوا جس میں ایران، ترکی اور بلغاریہ کے سفر کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تاریخ، تہذیب اور مذہب کو بھی بیان کیا گیا۔ ان کا ایک اشاعتی ادارہ جمہوری پبلیکیشنز کے نام سے ہے جہاں ان کی اپنی کتب کے علاوہ دیگر کتب اور تراجم شدہ کتب شائع ہوتی ہیں۔ فرخ سہیل گوئندی کی ازدواجی زندگی کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کا نکاح ترکی میں ایک لبنانی نژاد ترک خاتون ریما گوئندی سے سادگی کے ساتھ ہوا۔ ان کی ازدواجی زندگی نہایت پرسکون ہے۔ ریما گوئندی کا تعلق لبنان کے ایک پڑھے لکھے متمول گھرانے سے ہے، ادب سے خاصا شغف رکھتی ہیں۔ جمہوری پبلی کیشنز جیسے ادارے کو قائم کرنے اور پھر اس کے اشاعتی پروگرام کو چلانے میں ریما گوئندی کا فرخ سہیل گوئندی کو مکمل ساتھ حاصل ہے اور وہ اس ادارے میں نائب کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔

سفر نامہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جس کا تعلق بیانیہ تکنیک سے ہے سفر نامہ میں سفر نامہ نگار ان واقعات اور حالات کو بیان کرتا ہے جس کا وہ چشم دید گواہ ہے۔ اس میں سفر نامہ نگار اپنے اس خطے کے تاریخی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور سماجی حالات و واقعات کو بیان کرتا ہے۔ اگر تاریخیت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ کسی بھی ادبی فن پارے کا مطالعہ اس عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی تناظر میں کیا جائے۔ کسی بھی سفر نامہ کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اس عہد کے تہذیبی، سیاسی اور سماجی عکاسی ملتی ہے جس عہد میں وہ سفر نامہ تخلیق ہوا۔ آئندہ آنے والے ابواب میں تاریخیت کے تناظر میں سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں موجود سیاسی، سماجی، تاریخی اور تہذیبی واقعات کا جائزہ لیا جائے گا۔ تاریخیت ادب پارے کو اس کے زمانی و مکانی تناظر میں جانچنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگلے ابواب میں اس کے عہد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جس دوران سفر نامہ نگار نے سفر طے کیا سفر نامے کا جائزہ لیا جائے گا۔ تاریخیت میں تاریخ کو اہم گردانا جاتا ہے اگلے ابواب کا مطالعہ کرتے ہوئے تاریخی عناصر جیسے سیاست، سماج، مذہب اور تہذیب کو مد نظر رکھا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ مولوی فیروزالدین،فیروز اللغات(لاہور: فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ،۲۰۱۳ء)، ص ۳٦۰۔

۲۔ مولوی محمد سید احمد دہلوی(مؤلفہ)،فرہنگ آصفیہ(جلد اول)، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو،۱۹۸۷ء، ص ۵۹۱۔

۳۔ محمد صادق علی گل، فن تاریخ نویسی :ہومر سے ٹائن بی تک (لاہور: پبلشر ایمپوریم،اپریل ۱۹۹۳ء)، ص ۱۰۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۵۔ڈاکٹر محمد اشرف کمال،تنقیدی نظریات اور اصطلاحات(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، دسمبر ۲۰۱۹ ء)، ص ۱۵۴۔

٦۔ ریاض صدیقی،"اردو تنقید کا مسئلہ اور نوتاریخیت"مشمولہ نو تاریخیت(فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۸ء) ، ص ۴۹۔

۷۔ڈاکٹر ناہید قمر،اردو ادب میں تاریخیت(اسلام آباد: پورب اکادمی، جنوری ۲۰۱۷ء)، ص ۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۔

۹۔ سید ازور عباس اور ڈاکٹر مطاہر شاہ ، "تاریخ ،تاریخیت اور نو تاریخیت :بنیادی تعقلات"مشمولہ اردو جلد ۹۷ شمارہ ۲، جولائی تا دسمبر ۲۰۲۱ء۔

۱۰۔ ناصر عباس نیر ، جدید اور ما بعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں) (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، دسمبر ۲۰۰۴ء) ص ۲۵۲۔

۱۱۔ پروفیسر عتیق اللہ، "نوتاریخیت اور اس کا پس و پیش"مشمولہ نو تاریخیت (فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۸ء)، ص ۴۷۔

۱۲۔ پروفیسر عتیق اللہ "تاریخیت و نوتاریخیت"، مشمولہ نو تاریخیت (فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۸ء)، ص ۵۷۔

۱۳۔ڈاکٹر جمیل جالبی،تاریخ ادب اردو (جلد دوم)،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۱۳ء)، ص ۱۱۔

۱۴۔ محمد صادق علی گل،فن تاریخ نویسی :ہومر سے ٹائن بی تک(لاہور: پبلشرز ایمپوریم،اپریل ۱۹۹۳ء)، ص ۴۔

۱۵۔ڈاکٹر محمد اشرف کمال،تنقیدی نظریات اور اصطلاحات(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۹ء)
ص۱۵۳۔
۱۶۔ناصر عباس نیر،جدید اور مابعد جدید تنقید(مغربی اور اردو تناظر میں)،(کرچی:انجمن ترقی اردو پاکستان
،دسمبر۲۰۰۴ء)ص۲۴۸۔
۱۷۔ریاض صدیقی،"اردو تنقید کا مسئلہ اور نوتاریخیت"مشمولہ نوتاریخیت (فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۸ء)
ص۴۹۔
۱۸۔ناصر عباس نیر،جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)(کراچی:انجمن ترقی اردو
پاکستان،دسمبر۲۰۰۴ء)،ص۲۴۸۔
۱۹۔ڈاکٹر الطاف انجم،اردو ادب میں مابعد جدید تنقید(اطلاقی مثالیں،مسائل و ممکنات)(لاہور:عکس
پبلشرز،۲۰۱۸ء)،ص۱۴۲۔
۲۰۔سید ازور شاہ،سید مطاہر شاہ،"تاریخ،تاریخیت اور نوتاریخیت:بنیادی تعقلات"مشمولہ اردو جلد۹۷ شمارہ۲ جولائی تا
دسمبر۲۰۲۱ء۔
۲۱۔محمد حسن،ادبی سماجیات(دہلی:مکتبہ جامعہ،۱۹۸۳)ص۱۴۔
۲۲۔ایضاً،ص۱۹۔
۲۳۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ،اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے ۱۸۵۷تک) (لاہور :سنگِ میل پبلی
کیشنز،۲۰۱۹)،ص۹۔
۲۴۔ڈاکٹر مبارک علی،برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات(جامعہ کراچی:پاکستان سٹڈیز سنٹر
،دسمبر۲۰۰۷ء)ص۹۱۔
۲۵۔ڈاکٹر گیان چند،اردو کی ادبی تاریخیں(کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۰ء)ص۲۲۔
۲۶۔ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر (مرتبین)، ادبی تاریخ نویسی (لاہور : پاکستان رآئٹرز کوآپریٹو
سوسائٹی،۲۰۱۰ء)ص۳۴۰
۲۷۔ڈاکٹر عبدالقیوم،تنقیدی نقوش،(نئی دہلی:اعتقاد پبلشنگ ہاؤس،۱۹۷۲ء)،ص۱۳۶
۲۸۔مولوی سید احمد دہلوی،فرہنگ آصفیہ،جلد دوم(نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۸۷ء)،ص۱۱۸۸
۲۹۔ایضاً
۳۰۔خالد محمود،اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ،(نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۲۰۱۱ء)،ص۲۲۔

۳۱۔ڈاکٹر شہاب الدین،''اردو میں حج کے سفر نامے'' (مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ)، ص۲۶۔
۳۲۔ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفر نامہ(لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی)، ص۵۲۔
۳۳۔مرزا حامد بیگ،اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ(لاہور: کلاسک ۱۹۹۹ء)، ص۹۔
۳۴۔ڈاکٹر وزیر آغا،"سفر نامے کی بحث"مشمولہ اوراق سالنامہ ۱۹۷۸ء ص۲۷۔
۳۵۔خالد محمود،اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ(نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۲۰۱۱ء)ص۱۷۔
۳۶۔ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفر نامہ(لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی)ص۶۸۔
۳۷۔مرزا حامد بیگ،اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ(لاہور: اورینٹ پبلشرز،۲۰۱۴ء)ص۹۔
۳۸۔ڈاکٹر روبینہ پروین، نو آبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفر نامے: سیاسی و سماجی مطالعہ(لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، اکتوبر ۲۰۲۲ء)، ص۲۷۔
۳۹۔ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفر نامہ(لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، س ن)ص۵۹
۴۰۔ایضاًص۶۴۔
۴۱۔خالد محمود،اردو سفر ناموں کا تنقیدی جائزہ(نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۲۰۱۱ء)ص۲۴۔
۴۲۔قدسیہ قریشی،اردو سفر نامے انیسویں صدی میں(نئی دہلی: جامعہ نگر، فروری ۱۹۸۷ء)، ص۵۴۔
۴۳۔ تحسین فراقی(مرتب)، مقدمہ عجائبات فرنگ مشمولہ عجائبات فرنگ،(لاہور: مکہ بکس،۱۹۸۳ء) ص۴۷۔

باب دوم:

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں زمانی انسلاک: ایک مطالعہ

ادب اپنے معاصر سماج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کسی بھی دور کے ادب کی تفہیم کے لیے اس عہد کی تہذیب، ثقافت، سماج، سیاست اور دیگر علوم کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاریخیت کے حوالے سے یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ ہر دور میں کچھ افکار و نظریات اور خیالات ابھرتے ہیں جن کی نوعیت انفرادی قسم کی ہوتی ہے ان کا اثر لامحالہ اس دور کے ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ تاریخیت کسی بھی ادبی فن پارے کو پرکھنے کے لیے اس کے عہد اور تاریخی تناظر کو مدِ نظر رکھتی ہے۔ اگر موضوعاتی سطح پر ادب کے مطالعے میں اس کا عہد یا تاریخی پس منظر نہیں ملتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اس تاریخیت کے زاویے سے باہر ہے بلکہ اس کا مطالعہ تاریخی لسانیات کی روشنی میں کیا جائے گا۔ تاریخیت میں متون کا مطالعہ تاریخی، سیاسی و تہذیبی شعور، عصری آگہی اور سماجی انسلاک کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ تاریخیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ کسی شے کی ماہیت اور قدر اس کے زمانی و مکانی تناظر میں کی جائے۔ تاریخیت ایک فکری رویہ ہے جس میں تخلیقی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین اس عہد کی سیاسی، اقتصادی، مذہبی، تہذیبی اور تاریخی تناظر میں کیا جاتا ہے۔

الطاف انجم اپنے مضمون نئی تاریخیت میں لکھتے ہیں:

> تاریخیت نے ایک اہم نکتہ ابھارا ہے کہ تاریخی واقعات اپنے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی قوتوں کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ یہ طاقت کسی سیاسی یا مذہبی، معاشرتی یا اقتصادی آئیڈیالوجی کی مدد سے کسی شعبۂ علم پر حاوی ہو جاتی ہے جو آگے چل کر دیگر علوم و فنون کے اصول و ضوابط اور اقتدار و ماہیت کے متعین کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ (1)

تاریخیت میں جہاں ادب پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تاریخی تناظر کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے وہیں فن پارے کا زمانی انسلاک بھی ضروری ہے۔ زمانی انسلاک سے مراد یہ ہے کہ کوئی بھی ادب پارہ جس عہد میں تخلیق ہوا کیا وہ اپنے عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ زمانی انسلاک میں اس بات کا مدِ نظر رکھا جاتا ہے کہ کسی بھی تخلیقی فن پارے میں وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو اپنے اس عہد کی تصویر کشی کرتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن

پارہ کس عہد کی تخلیق ہے؟زمانی انسلاک کی وضاحت کرتے ہوئے،اس مفہوم کو مزید تفصیل سے یوں سمجھایا جا سکتا ہے۔زمان عربی سے ماخوذ اسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جس کا مطلب ہے ''وقت، دور، عہد یا عرصہ'' اس کے ساتھ ''ی'' کی اضافت لگا کر فعل ذاتی بنتا ہے جس کا معنی'' زمانے کا، وقت کا یا عہد کا'' ۔''انسلاک ''اس کا اصل مادہ عربی کا لفظ ''سلک'' ہے، جس کے معنی ہیں'' تعلق، رشتہ، قطار، وغیرہ۔یہ مختلف جملوں میں مختلف مفہوم دیتا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ ''زمانی انسلاک'' کسی شے کا اس کے وقت یا دور سے تعلق ظاہر کرتا ہے۔ادب کی کوئی بھی صنف ہو اسکے لیے تخیل ادیب اپنے ارد گرد سے ہی اخذ کرتا ہے۔ماحول اور اس میں ہونے والے تمام واقعات ادیب کی زیرک نگاہ میں ہوتے ہیں اور وہ اُن سے قطع نظر کرکے ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔اس کے علاوہ وہ ماضی میں ہونے والے چیدہ چیدہ واقعات سے باخبر ہوتا ہے اور ضروریات کے تحت ان کا حوالہ دیتا ہے یا پھر اپنی سوجھ کے مطابق اس کو بیان کرتا ہے۔زمانی انسلاک کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی ملک یا علاقے میں سیاسی اور اجتماعی نظام کی معمولیت کے قواعد وضوابط پر ایک غیر عادی اثر پڑتا ہے۔یہ غیر معمولی حالات تھوڑے عرصے کے لئے ہوتی ہیں اور عموماً مختلف وجوہات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح غالب کے خطوط ۱۸۵۷ء کی اجڑی دہلی کے بارے میں معلومات کا معتبر ذریعہ ہیں،اسی طرح انقلاب ایران پر مختار مسعود کی کتاب لوح ایام اس وقت کے ایران کی شب وروز کروٹیں لیتی ہوئی سیاسی وسماجی زندگی کے بارے میں سب سے اہم دستاویز ہے کیونکہ انقلاب ایران کے ہنگامے اور شورش کے وہ عینی شاہد تھے۔آواز دوست اور سفر نصیب کے بعد یہ ان کی تیسری تصنیف تھی۔زمانی انسلاک کی وجوہات میں ایک اہم وجہ سیاسی اضطراب ہے۔سیاسی تنازعات، سیاسی جماعتوں کے درمیان اختلافات، حکومتی ناکامی یا قانون ونظام میں ناانصافیاں زمانی انسلاک کا باعث بنتی ہیں۔اقتصادی بحران بھی زمانی انسلاک کی وجہ بن سکتا ہے۔مثلاً، معیشتی رکاوٹوں کی بنا پر ملک کا معیشتی نظام کمزور ہونا،، غیر مستحکم کاروباری شرائط، بڑھتی ہوئی بے روزگاری، قدرتی آفات اور بین الاقوامی تنازعات وغیرہ اقتصادی مسائل پیدا کر سکتے ہیں جو زمانی انسلاک کا باعث بنتے ہیں۔معاشرتی تنازعات، انقلابی حالات، احتجاجات، طبقاتی تقسیم، عدم تیقن کی کیفیت، مذہبی تنازعات وغیرہ کی بنا پر عوام میں بے چینی پیدا کرتی ہے جو زمانی انسلاک کا باعث بن سکتی ہے۔بین الاقوامی واقعات بھی زمانی انسلاک کی ایک عام وجہ ہو سکتے ہیں کیونکہ بین الاقوامی روابط اور تعاون ملکی سطح پر اثر انداز ہوتا ہے۔بین الاقوامی سطح پر جنگ، سیاسی تنازعات، تجارتی تنازعات، عدم استحکام، یا بین الاقوامی تنقید کی وجہ سے حکومتی نظام کمزور ہو سکتا ہے جو زمانی انسلاک کا موجب بن سکتا ہے۔

سفر نامہ ایک جدید نثری صنف ہے اس میں تخلیق کار کسی سفر سے جڑی پوری کہانی یا اس سے متعلق کسی خاص واقعہ کا ذکر کرتا ہے۔سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جسے مسافر سفر کے دوران یا منزل پر پہنچ کر اپنے تجربات اور مشاہدات کی مدد سے تحریر کا جامہ پہناتا ہے اور اپنی گزری ہوئی کیفیات سے دوسروں کو واقف کراتا ہے۔راہ میں پیش آنے والے

اپنے تحیّر، استعجاب اور اضطراب کو اس طرح سے قلم بند کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے نہ صرف پوری تصویر آجاتی ہے بلکہ اس مقام سے متعلق تمام معلومات مع تفصیل اس کے علم اور آگہی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ سفر نامے میں ایک عہد کی مذہبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کا بیان ہوتا ہے جو اپنے عہد کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ سفر نامے میں زمانی انسلاک کے عناصر بدرجہ اُتم موجود ہوتے ہیں کیونکہ سفر نامہ نگار کے سفر کے دوران اگر وہاں ایسے حالات موجود ہیں جو زمانی انسلاک کا سبب بنتے ہیں تو سفر نامہ نگار ان واقعات کا عینی شاہد ہوتا ہے اور انھیں وہ اپنے سفر نامے میں بیان کرتا ہے۔

فرخ سہیل گو ئندی نے ۱۹۸۳ء میں ایران، ترکی اور بلغاریہ کا زمینی راستے کے ذریعے سفر اختیار کیا۔ فرخ سہیل نے دوران سفر جن چیزوں کو دیکھا اور محسوس کیا اسے اپنی ڈائری میں محفوظ کرتے چلے گئے اور ۲۰۲۱ء میں کرونا وبا کے سبب دو سال کی فراغت کے سبب وہ اپنا سفر نامہ تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سفر نامہ ۲۰۲۱ء میں تخلیق ہوا لیکن یہ ۱۹۸۳ء کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ اس سفر نامے میں فرخ صاحب نے وہاں کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، سیاست، مذہب وغیرہ کو موضوع بنانے کا ساتھ ساتھ وہاں کے حالات جن کا انھوں نے براہ راست مشاہدہ کیا ان کو بھی بیان کیا ہے۔ اس سفر نامے کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری ۱۹۸۳ء کے دور سے گزر رہا ہے۔ انھوں نے ۱۹۸۳ میں یہ ایک سیاح کے طور پر سفر کیا اور اس دور کی تاریخ، سیاست اور معاشرتی حالات کو دیکھا اور اس کو اپنے سفر نامے میں محفوظ کر لیا۔ سفر نامہ نگار کی خصوصیات کا مطالعہ کیا جائے تو ایک سفر نامہ نگار کا مشاہدہ وسیع اور عمیق ہونا چاہیے کیونکہ ایک سفر نامہ نگار جب اس خطے کے حالات و واقعات بیان کرتا ہے تو وہ حقیقتاً اس خطے کی تاریخ مرتب کر رہا ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ ماضی کے واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو سفر نامہ نگار اپنے عہد کی تاریخ کا گواہ ہوتا ہے وہ وہی کچھ بیان کرتا ہے جس کا اس نے مشاہدہ کیا ہوتا ہے۔ فرخ سہیل صاحب نے سفر اختیار کیا تب ان ممالک کی دنیا آج کے دور سے بالکل مختلف تھی۔ اس دور میں ایران میں انقلاب برپا ہوئے ابھی چار سال بیتے تھے اور ایران میں اس کے اثرات نمایاں تھے۔ ترکی میں تب جنرل کنعان ایورن کا مارشل لاء لگا ہوا تھا تب کے حالات اور واقعات کا آج کے دور سے بالکل مختلف تھے۔ اور بلغاریہ جو کہ ایک سوشلسٹ ملک ہے وہ آج کی دنیا سے بالکل مختلف تھا۔ سفر نامے میں فرخ سہیل نے اس دور کو محفوظ کیا ہے جو گزر چکا ہے۔ اس حوالے سے وہ سفر نامے کے ''جہاں نامہ'' جو کہ پیش لفظ کی صورت میں شائع ہوا اس میں لکھتے ہیں۔

> ''میں ہوں جہاں گرد'' ایک ایسی سیاحت کی داستان ہے کہ اگر آج انہی راہوں پر سفر کیا جائے تو آج کی دنیا اس سے بہت بدل چکی ہے۔ خمینی کا ایران جہاں انقلاب کی

حدت بھی جوبن پر تھی، ترکی جہاں کنعان ایورن کا مارشل لاء عروج پر تھا اور بلغاریہ میں کمیونزم... میں نے سیاحت کے دوران جہاں جہاں کا سفر کیا وہ قصبے، شہر اور ملک آج اڑتیس برس بعد بہت حد تک بدل چکے ہیں۔ اس لیے میں نے اپنے سفر نامے کو ۱۹۸۳ء کے وسط میں کیے گئے سفر تک ہی محدود رکھا ہے۔۔۔۔ خصوصاً اس زمانے میں منجمد رہ کر لکھنا کہ ۱۹۸۳ء میں استنبول کی آبادی پچاس لاکھ تھی تو اسے ویسا ہی لکھنا، یا وہ ایران جہاں ابھی امام خمینی حیات تھے اور ایران عراق جنگ اپنے عروج پر تھی اور سب سے بڑھ کر سوشلسٹ بلغاریہ کو اسی زمانے میں قید رکھ کر لکھنا ایک محقق اور سیاح کے طور پر کٹھن کام تھا۔ بلغاریہ جو میں نے دیکھا وہ کمیونسٹ بلغاریہ تھا جبکہ آج کا بلغاریہ ایک سرمایہ دار دنیا کا اہم ملک ہے... اور پھر مشکل یہ کہ بلغاریہ کے کئی محلوں، گلیوں، شاہراہوں، بستیوں حتیٰ کہ شہروں کے نام بھی بدل گئے، سارا نظام ہی بدل گیا۔ (۲)

جنگی واقعات کے عموماً مختلف عوامل ہوتے ہیں جو زمانی انسلاک کا سبب بنتے ہیں۔ سیاسی تنازعات عام طور پر ملکی یا بین الاقوامی سطح پر وقوع پذیر ہوتے ہیں جو جنگ کا سبب بنتے ہیں۔ سیاسی تنازعات کے علاوہ سرحدوں یا علاقوں کی تقسیم اور اقتصادی مسائل بھی جنگوں کا باعث بنتے ہیں۔ ایران اور عراق کی جنگ کا سبب دریائے شط العرب ہے لیکن ماہرین اور مندوبین کی نظر میں عراق نے دریائے شط العرب کا محض ایک بہانہ قرار دے کر امریکہ کی سازشوں کی وجہ سے ایران پر حملہ کیا۔ ایران عراق کی سرحدوں کے تعین کے لیے مختلف ادوار میں مختلف معاہدے طے پاتے رہے لیکن کوئی بھی معاہدہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پایا بالآخر ۱۹۱۳ء میں معاہدہ استنبول کے تحت برطانیہ، روس، ایران اور سلطنت عثمانیہ کے نمائندوں پر مشتمل چار رکنی کمیشن نے ایک سال کی کوشش کے بعد ۱۹۱۴ء میں ایران، عراق کی سرحدوں کا تعین کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت بر سرِ اقتدار آئی اور اس نے معاہدہ استنبول کو توڑ دیا۔ عراق نے اس مسئلے کو انجمن اقوام (League of Nations) میں پیش کیا اور دونوں ممالک کے آپس کے مذاکرات کے بعد ۱۹۳۷ء میں ایک معاہدے پر دستخط کے بعد ۱۹۱۳ اور ۱۹۱۴ء کے معاہدہ کو دوبارہ قبول کر لیا گیا۔ لیکن ایران نے ۱۹۶۹ء میں اس معاہدہ کو ختم کر دیا۔ اور اس کے بعد دونوں ملکوں کے مابین جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۷۵ء میں الجزائر کی حکومت کی مداخلت سے ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کے بنیادی نکات میں شامل تھا کہ

۱۹۳۷ء میں ہونے والے معاہدے کو منسوخ کر دیا جائے (اس معاہدے میں شط العرب پر ایرانی حاکمیت کی نفی کی گئی)۔

- ایران میں عرب کردوں کا داخلہ بند کر دیا گیا اور ایران کردوں کی مالی مدد نہیں کرے گا۔
- ایران اور عراق مل کر خطے کو بیرونی طاقتوں اور خلفشاروں سے محفوظ رکھیں گے۔

کچھ عرصہ تو اس معاہدے پر عمل کیا گیا لیکن ۱۹۸۰ء میں عراق کی فوج نے ۱۹۷۵ء کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کو توڑ ڈالا اور ایران پر حملہ کر کے اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اقوام متحدہ نے دونوں ممالک کو جنگ ختم کرنے کی درخواست کی جس پر صدام حسین نے اپنی شرائط پیش کیں، جس کے مطابق ایران عراق کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ شط العرب پر عراق کا حق مانا جائے اور ایران میں واقع آبنائے ہرمز پر تین جزیرے عرب کی ریاستوں کو واپس کرے جس پر ایران نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں قبضہ کیا تھا۔ لیکن ایران نے جنگ بند کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اسلامی ممالک کے ایک ذیلی ادارے امہ امن کمیٹی نے ایک منصوبہ بنایا جس میں کچھ نکات مرتب دیئے گئے جن کے تحت جنگ ختم کرانے کی کوشش کی گئی۔ ان نکات میں دونوں ممالک کو فوراً جنگ بندی کا حکم دیا گیا، عراق کی فوج ایران کی سرزمین سے واپس چلی جائے اور اسلامی کانفرنس کے زیرِ اہتمام اپنے مذاکرات طے کریں۔ لیکن بعد میں ایران اور عراق نے بات ماننے سے انکار کر دیا اور حالات مزید خراب ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۸۷ء میں یو این او کے تحت جنگ بندی کے لیے شرط رکھ دی گئی کہ جو ملک جنگ بند نہیں کرے گا اس کو ہتھیار فراہم نہیں کیے جائیں گے اور ایک قرارداد منظور کی گئی۔ ایران نے اس قرارداد کو ماننے سے انکار کر دیا پھر ۱۹۸۷ء میں اقوام متحدہ کے سیکٹری جنرل نے ایران کے حکام کے ساتھ بات چیت سے معاملات حل کرنے کی کوشش کی جس پر ایران نے رضامندی ظاہر کی۔ ۱۹۸۸ء میں جنگ نے پھر شدت اختیار کر لی جس کے نتیجے میں بہت سے شہری ہلاک ہوئے اور مالی نقصان بھی دونوں ممالک کو برداشت کرنا پڑا جو کھربوں ڈالر کے حساب سے ہوا۔ اس جنگی صورتحال کے دوران سفر نامہ نگار نے ایران کا سفر کیا اور اس دوران ہلاکتوں کی وجہ سے اور عراق اور امریکہ کے خلاف جو نعرے بلند کیے گئے اور جو مظاہرے ہوئے اس کو سفر نامہ نگار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس صورتحال کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑا سا جلوس ''مرگ بر امریکہ''، مرگ بر صدام'' کے نعرے لگاتا ہوا شہر کی کی ایک بڑی شاہراہ پر برآمد ہوا۔
> عورتیں سیاہ چادروں میں۔ فارسی زبان میں میں نے پہلی بار نعرے بازی سنی اور وہ بھی ہزاروں لوگوں کی آواز میں۔ جلوس میں شامل بزرگ خواتین نے نوجوانوں کی تصاویر اٹھار کھی تھیں اور

جلوس میں چند تابوت بھی شامل تھے۔ عراق کے خلاف لڑتے ہوئے ایرانی شہدا کے تابوت اور ہاتھوں میں اٹھائی ان کی تصاویر۔ مرگ برامریکہ۔ مرگ برامریکہ۔ درود و سلام کرتا جلوس۔ یہ میرے لیے ایک نیا مشاہدہ تھا۔۔۔۔ جلوس شہیدوں کے لیے سینہ کوبی کے ساتھ امریکہ اور صدام حسین کے خلاف بھی بھرپور انداز میں نعرے بازی کر رہا تھا۔ لاہور کی سڑکوں پر فوجی آمریت اور اس کے سرپرست امریکہ کے خلاف نعرے لگانے کی یہاں کھل کر تسکین کی کیوں کہ یہاں امریکہ کے خلاف نعرے بازی پر حوصلہ افزائی جبکہ لاہور میں کوڑے پڑتے تھے۔ اب میں واقعی سیاسی جہاں گرد تھا۔

مرگ برامریکہ! مرگ برامریکہ! (۳)

فرخ سہیل نے ۱۹۸۳ء میں ایران کا سفر اختیار کیا، وہاں تب انقلاب ایران کے اثرات نمایاں تھے۔ انقلاب ایران ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ اس انقلاب کی قیادت ایرانی رہنما آیت اللہ خمینی کر رہے تھے۔ انقلاب سے قبل محمد رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی۔ محمد رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی شاہی دور ختم ہوا اور اسلامی جمہوریہ ایران معرض وجود میں آیا۔ ایران کے انقلاب کے برپا ہونے کے پیچھے کئی گہرے مذہبی، تہذیبی، سیاسی، اقتصادی عوامل شامل تھے۔ انقلاب ایران کی ایک وجہ بیرونی طاقتوں کی یلغار تھی اور شاہی طاقت کا استعمال بیرونی طاقتوں کے تابع ہوتا جا رہا تھا۔ ایران میں اس کے خلاف نعرے بلند ہونے لگے۔ انقلاب کے بعد ایران میں سیاسی، معاشرتی اور سماجی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ملک میں اسلامی نظام کے نافذ کی کوششیں کی گئیں۔ انقلاب کے بعد قانونی تبدیلیاں سامنے آئیں جس میں شرعی اصولوں پر مبنی نظام کو لاگو کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ اس کے علاوہ معاشرے پر مذہب کے حوالے سے بھی اثرات نمایاں ہوئے جس کی وجہ سے معاشرے میں اسلامی اقدار اور نظام کو نافذ کیا گیا۔ عورت کو معاشرے لازمی فرد سمجھا گیا۔ انقلاب کے بعد عورتوں کے سماجی حقوق میں بھی تغیرات نظر آئے، عورتوں کو تعلیم اور صحت وغیرہ کی سہولیات دی گئیں اور انھیں وراثت میں ان کا حصہ دیا جانے لگا۔ ان کے لباس اور حجاب پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ عورتوں کے لباس میں چادر کا استعمال لازمی قرار دیا گیا اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف کارروائی کی جاتی اور اس کے لیے سزا مقرر کی گئی۔ فرخ سہیل نے جب ایران کا سفر کیا تب انقلاب برپا ہوئے ابھی چار سال بیتے تھے اور اس کے اثرات نمایاں تھے۔

فرخ سہیل اس حوالے سے لکھتے ہیں:

سیاہ رات کے اندھیرے میں سیاہ چادروں میں ملبوس خواتین اور چادروں میں سے نکلے کانوں سے سے آگے تک سفید چہرے دیکھ کر ایسے لگا، کسی اور ہی جہان میں ہوں۔ ایرانی انقلاب کے بعد حجاب اس انقلاب کے کی پوری دنیا میں ایک شناخت بنا۔ اور پھر ایرانی انقلاب کے بعد دیگر مسلم دنیا

> میں خواتین میں حجاب ہر آئے سال بڑھتا گیا۔ کہتے ہیں انقلاب ایران کے دوران مغربی لباس پہننے والی خواتین نے سرِ بازار مغربی لباسوں کے اوپر سیاہ چادریں پہن کر مظاہرے کیے اور یوں نئی مذہبی شناخت اختیار کرنے کا اظہار کیا۔ ایران میں انقلاب کے بعد حجاب کو ریاستی سطح پر نافذ کیا گیا۔ اس کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں طے کی گئیں۔ (۴)

۱۹۷۸ء کے اختتام پر اور ۱۹۷۹ء کے آغاز میں ایرانی انقلاب لانے کے لیے عوام بہت زیادہ پر جوش تھی اور اس کے لیے جگہ جگہ آوازیں بلند کی جاری تھیں۔ یہ نعرے صرف ایران ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے مختلف خطوں میں انقلاب ایران کے لیے آواز بلند کی جاتی رہی۔ یہ انقلااب اتنا پر اثر تھا کہ اس کے اثرات پوری دنیا پر نمودار ہوئے۔ اس عرصے میں رضا شاہ پہلوی کو جلاوطن کر دیا گیا اور آیت اللہ امام خمینی چودہ سال کی جلاوطنی کاٹ کر وطن واپس آئے تھے۔ اس عرصے میں امریکہ خفیہ طور پر ایران عراق جنگ میں عراق کا ساتھ دے رہا تھا اور ایران میں انقلاب کو ناکام بنانے کو کوششوں میں مصروف تھا۔ امریکہ کے اس عمل کے خلاف رد عمل کے طور پر ایران میں زبردست نعرے بازی کی گئی اور امریکہ کی سازشوں کو ناکام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں انقلاب برپا کرنے کے لیے دنیا بھر میں آواز اٹھائی گئی اور پاکستان میں بھی ایرانی انقلاب کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ دنیا میں جہاں جہاں ایرانی پھیلے ہوئے تھے انھوں نے اپنے وطن کے لیے آواز بلند کرتے رہے۔

فرخ سہیل لکھتے ہیں:

> یکم فروری ۱۹۷۹ء کے روز ایرانی انقلاب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا، جب رہبر انقلاب سید روح اللہ موسوی خمینی اپنی چودہ سالہ جلاوطنی ختم کرکے واپس ایران پہنچے اور شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی جلا وطن کر دیئے گئے۔ میرے جیسے ترقی پسند ایکٹوسٹ کے لیے اپنی چڑھتی جوانی میں اس انقلاب کو دیکھنے کا تجربہ ایک بڑی خوش نصیبی ہے۔ ان دنوں لاہور میں اردنی، فلسطینی، ملائیشین اور عرب ممالک کے علاوہ بڑی تعداد ایرانی طالب علموں کی ہوتی تھی، خصوصاً انجینئرنگ UET میں۔ ایرانی انقلاب کے لیے شہنشاہ ایران کے خلاف یہ طلبا لاہور کی سڑکوں پر مظاہرے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ ان مظاہروں میں شامل ہو کر ہم بھی اپنا حصہ ڈالتے تھے اور بلند آواز میں ''مرگ بر امریکہ'' کا فارسی زبان میں نعرہ لگا کر اپنی نظریاتی تسکین کرتے تھے۔ (۵)

جنرل ضیاالحق پاکستانی فوج کے سابق سربراہ تھے جنھوں نے ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت گرا کر مارشل لاء لگایا اور بعد میں صدر کا عہدہ سنبھالا۔ جنرل ضیاالحق کا عہد انتہائی فتنہ انگیز تھا۔ اس کا دور متشدد نظام کے تحت گزرا، اس دوران جنرل ضیاالحق نے سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا اور چھ مہینے تک ملک میں سیاسی انتظامی سروس کو معطل کیا۔ ضیاالحق کے دور حکومت میں پاکستان کے سیاسی و معاشرتی حالات مایوس کن تھے۔ اس کے دور

میں امریکہ سے مدد لی گئی پاکستان اور افغانستان میں مجاہدین کی حمایت بڑھائی گئی۔ اس کا دور حکومت پاکستان کی سیاسی تاریخ میں متنازعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے دور حکومت میں پاکستان کے ہمسایہ ممالک میں جنگ و جدل عروج پر تھا۔ ایران میں انقلاب برپا تھا جس کی وجہ سے تین دن تک پاکستان سیکرٹریٹ بند رہا اور عراق ایران جنگ عروج پر تھی۔ ''جنرل ضیاالحق اور امریکہ'' عنوان سے ایک مضمون میں ان حالات کو اس طرح بیان کیا گیا۔

جنرل ضیاء الحق کا دور انتہائی پر آشوب اور پر فتن تھا۔ پاکستان کے تقریباً تمام ہمسایہ ممالک جنگ و جدل اور معاشی تباہ حالی کا شکار تھے۔ ایران خمینی انقلاب کی راہ پر گامزن تھا۔ ایرانی انقلاب نے پاکستان کے اندر انقلابی ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ پاکستان کا مرکزی سیکرٹریٹ تقریباً تین دن معطل رہا۔ ایران عراق جنگ شروع ہو گئی۔ سارا مشرق وسطیٰ مذکورہ جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔۔۔انہوں نے نظام مصطفی کی عوامی تحریک کے تناظر میں منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ دور حاضر میں آمریت کی نسبت جمہوریت بہترین نظام حکومت سمجھا جاتا ہے لہٰذا ضیاء الحق جمہوریت کے دشمن اور فوجی استبداد کا نمائندہ کہا جاتا ہے یہ الگ بات کہ مذکورہ منتخب وزیراعظم بھی اقتدار کے لیے جمہوری اصولوں پر شب خون مار کر آئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور میں جمہوریت کی بحالی کی تحریک جاری رہی جبکہ روس نواز پاکستان کمیونسٹوں کے حلقے بھی منظم اور موثر تھے جو ایشیا سرخ کا نعرہ لگاتے پھرتے تھے بھٹو کی پھانسی کے بعد حالات خراب سے خراب تر ہو گئے۔ اس تناظر میں پاکستان کے اندر روس، امریکہ، اسرائیل، بھارت، برطانیہ وغیرہ کو پاکستان میں مداخلت کا مضبوط رسوخ حاصل ہوا جو آج خطرناک روپ کی صورت میں جلوہ گر ہے۔[٦]

ایران میں اسلامی انقلاب برپا کرنے میں دیگر عناصر کے ساتھ سب سے اہم عوامی ادارے تھے۔ انقلاب ایران کو پھیلانے اور اس کو پروان چڑھانے میں ایرانی عوام نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ انقلاب کی قیادت کرتے ہوئے عوام جس انداز میں گھروں سے نکلی وہ بہت ہی مؤثر ثابت ہوا۔ ایران میں لوگ ایرانی انقلاب کی قیادت کرتے ہوئے بادشاہت کی جگہ اسلامی حکومت لانا چاہتے تھے۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے برپا ہونے میں عوام کے ایک عرصہ انتظار کرنا پڑا اور اس کے لیے بہت سے قربانیاں دی گئیں۔ مبصرین عام طور پر ایرانی انقلاب کے آغاز پر بات کرتے ہوئے اس کا آغاز ٦ جون ١٩٦٣ء کو سمجھتے ہیں۔ رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے خلاف جدوجہد میں عوام نے اہم کردار ادا کیا۔ اسلامی انقلاب کو کامیاب بنانے میں امام خمینی کی رہنمائی اور قیادت میں لاکھوں لوگوں نے حصہ لیا۔ یہ اپنی تاریخ کا بہت بڑا انقلاب تھا اس لیے اس انقلاب کا موازنہ گزشتہ صدیوں کے انقلابات کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ فرخ

سہیل انقلاب کے عوامی ہونے اور لوگوں کے نعروں کا جس کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نہ صرف اسے دیکھا بلکہ خود بھی اس جلوس میں شرکت کی اس کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں۔

> مشہد میں امریکہ مخالف جلوس میں شامل ہو کر جہاں گرد، یکایک ایکٹوسٹ بن گیا ایک ہاتھ میں مانگے کی سائیکل کا ہینڈل اور دوسرا ہاتھ ہوا میں نعروں کے ردھم کے ساتھ بلند ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اردو میں نعرے لگاؤں، "امریکہ کا جو یار ہے غدار ہے غدار ہے" جوان دنوں ہمارے ہاں مقبول نعرہ تھا مگر یہاں کون سمجھے گا میری اردو! ایرانی انقلاب پچھلی صدی کا ایک بڑا انقلاب ہے جسے میں نے اپنی اور انقلاب کی جوانی میں دیکھ لیا۔ جلوس، شہیدوں کے سینہ کوبی کے ساتھ امریکہ اور صدام کے خلاف بھی بھرپور نعرے بازی کر رہا تھا۔ (۷)

انقلاب ایران کے دوران انقلاب کو کامیاب بنانے میں تعلیمی درسگاہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران دانش گاہوں کو ملکی سیاست کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہاں طلبا نے شہنشاہی نظام سے چھٹکارا پانے اور امریکیوں کی خفیہ پالیسیوں سے نجات کے لیے طلبا نے نعرے بلند کیے۔ اس کے علاوہ تعلیمی درسگاہوں کو بند کر دیا گیا اور یہاں نالقاب کے حوالے سے جلوس نکالے جاتے اور خطبات دیئے جاتے۔ انقلاب سے پہلے پہلوی دور حکومت میں تعلیمی سہولیات کی کمی تھی اور بس ایک اقلیتی جماعت تک ہی تعلیمی سرگرمیاں محدود تھیں لیکن انقلاب کے بعد تعلیمی نظام میں بہتری لاتے ہوئے انصاف کے اصولوں کو عمل میں لاتے ہوئے آزادی تعلیم کی پالیسیاں تشکیل دی گئیں جس کی وجہ سے تعلیمی نظام میں بہتری اور ہر کسی کے لیے تعلیمی حصول کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ ایران میں تعلیمی نظام میں بھی تبدیلیاں لائی گئیں اور دینی تعلیم، قرآن کی تعلیم اور اسلامیات وغیرہ کو نصاب میں شامل کیا گیا۔ انقلاب ایران کے بعد انقلابی نظریات اور افکار کو فروغ دیا گیا اور خواتین کے تعلیم کے حصول کے لیے آسانیاں پیدا کی گئیں۔ انقلاب کے بعد تعلیمی نظام کو بہتر بنانے سے ملک کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ انقلاب کے بعد مساجد، تعلیمی درسگاہوں میں خطبات دئے جاتے اور ایک قانون بنا لیا گیا کہ اس کے بعد بھی امریکیوں اور پہلوی سلطنت کے خلاف نعرے شامل کیے گئے۔

فرخ سہیل دوران سیاحت کا احوال بتاتے ہیں:

> ان کے خطبہ سے پہلے اور اور دوران ایک ادھیڑ عمر شخص بڑے تجربہ کارانہ انداز میں بار بار مائیک پر آکر " مرگ بر امریکہ " جیسے معروف نعرے لگاتا جاتا ہزاروں نمازی جواب دیتے۔ اسی رات میں نے صادق گنجی مرحوم کے ایک دوست محمد قالیباف کی شریک حیات سے اس شخص کا ذکر کیا کہ کمال کا نعرے باز تھا یہ شخص، بڑا متاثر کن تھا۔ اس ایرانی خاتون نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، "

> فرخ بھائی، یہ ہمارا وزیرِ نعرہ ہے۔ یہ انقلاب کے دنوں سے ہی یہ کام کرتا آیا ہے اور اب اس پر ''اللہ کی رحمتیں'' ہیں، زندگی بدل گئی اس وزیر نعرہ کی یہ ہمارا قومی نعرہ ہے۔ (۸)

انقلاب ایران جس کی قیادت روح اللہ خمینی کر رہے تھے، اس سے قبل رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی جو امریکی حمایت اور سہولت کاروں کو استعمال کر رہے تھے جس کی بدولت ملکی نظام تباہ پذیر تھا۔ امریکہ شاہ کو مالی اور انتظامی مدد فراہم کر رہا تھا جس کی وجہ سے دونوں ممالک کے تعلقات آپس میں مضبوط تھے لیکن ۱۹۷۹ء میں انقلاب کے بعد ایرانی حکومت امریکہ کو اپنا دشمن تصور کرنے لگی اور انقلابیوں نے امریکہ کے خلاف نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے۔ مصنف نے اس دور کی تصویر کشی کرتے ہوئے رہنماؤں اور عوام دونوں کا طرزِ عمل بھی بتایا ہے کہ کیسے انھوں نے اپنا وزیر نعرہ رکھا ہوا ہے جو ان کے قومی جذبے کا ترجمان تھا۔ اس لیے مصف کہتے ہیں کہ جب میں صادق گنجی مرحوم کے ایک دوست کی اہلیہ سے اس نعرے کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ مرگ بر امریکہ کے نعرے لگانے والے اس شخص پر اللہ کی رحمتیں ہیں۔ رضا شاہ پہلوی امریکی حکومت کو سہولت کار مہیا کرتا تھا دونوں ممالک کے آپس کے مضبوط تعلقات تھے ۱۹۸۰ء میں انقلاب کے حامیوں نے امریکی سفارتی عمارت کو قبضہ میں لے لیا۔ اس دوران میں ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک ایران عراق جنگ ہوئی جس میں امریکہ نے عراق کا ساتھ دیا۔ اس دوران ایرانی حکومت کا مقصد امریکی تشدد کا مقابلہ کرنا اور انقلاب کے مقاصد کو مزید مستحکم بنانا تھا۔ فرخ سہیل کے سفر کے دوران ایران کے حالات بہت کشیدہ تھے اس دوران انھوں نے وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا اور اس کو اپنے سفر نامے میں بیان کیا۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ان دنوں پاکستانی سفارت خانے پر ایرانی خفیہ والے اور دیگر ادارے کڑی نظر رکھتے تھے، اس لیے کہ امام خمینی کا انقلاب ایران ''مرگ بر امریکہ'' کے پرچم تلے ہوا تھا اور جنرل ضیا ''امریکی پرچم تلے'' حکمرانی کر رہا تھا۔ ایرانیوں کو پورا یقین تھا کہ پاکستانی سفارت خانہ، جنرل ضیا کے آقا کے مفادات کی بھرپور نگہبانی کر رہا تھا۔
>
> اس لیے جب جنرل ضیا اپنی سفارت کاری کے 'جوہر دکھانے' کچھ عرصہ پہلے تہران پہنچا تو ایرانی طلبہ نے تہران کی سڑکوں پر جگہ جگہ بینر لگا دیئے۔''
>
> ''سگ امریکہ آمد است''(۹)

کاخ گلستان ایران کا ایک اہم تاریخی شہر ہے جو تہران، ایرن کے وسطی حصے میں واقع ہے۔ یہ محلات کا مجموعہ ہیں جو ایرانی شہنشاہ قاجار کے دورِ حکومت میں بنائی گئی۔ یہ ایرانی تاریخ اور فنون کا گہوارا ہے۔ انقلاب ایران کے بعد ۱۹۷۹ء میں جب شاہی حکومت کو ختم کر دیا گیا کاخ گلستان بھی انقلاب کا شکار ہوا۔ انقلاب کے بعد کاخ گلستان کے

باغات اور اور دروازوں کو دوبارہ قابل استعمال بنایا گیا،اسے عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا،اس کے باغات اور دروازوں کو عام عوام کے لے کھول دیا گیااور اس کی ساخت اور تاریخی ورثہ کو بحال رکھنے کی کوشش کی گئی۔انقلاب کے بعد وہاں پاسداران انقلاب نے اپنا ایک مرکزی دفتر بنایا اور اس کو انتظام و انصرام کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ پاسداران انقلاب نے ان محلات پر قبضہ کر لیااور شاہی زندگی اور ان کے رہن سہن کو تنقید کا نشانہ بنایا۔کاخ گلستان کے کچھ حصے عام عوام اور سیاحت کے لیے کھول دیئے گئے، فرخ سہیل کاخ گلستان کی سیاحت کا احوال بیان کرتے ہیں اور اس دوران سیاحتی گائیڈ جو پاسداران انقلاب سے تھااس کی گفتگو کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔

میں دیگر سیاحوں کے ساتھ قطار میں کھڑا ہو گیا۔میرے سوا وہاں کوئی بھی غیر ملکی سیاح نہیں تھا، سب ایرانی مرد، خواتین اور بچے تھے۔محلات کے اس کمپلیکس میں جو شخص سیاحوں کی رہنمائی کر رہا تھا،اس سیاحتی رہنما کی اصل ذمہ داری سیاحوں کے سامنے شاہی خاندان کی ''عیاشیاں'' بے نقاب کرنا تھی۔

''دیکھیں شاہ ایران کیسے عالی شان گھر میں رہتا تھا''

''لاکھوں عام ایرانی، معمولی گھروں کی ملکیت سے بھی محروم اور ''خائن'' شاہ ایسے ہی گھروں کا مالک...''

''قالین دیکھیں اور فانوس، عام لوگوں کے گھروں میں دریاں اور بجلی کے بلب ہیں اور یہاں کروڑوں تمان کے ریشمی قالین اور دنیا بھر سے اکھٹے کیے گئے کرسٹل کے فانوس۔''

''دیکھیں یہ نایاب کراکری، سونے کے چمچ اور سونے کے پانی میں رنگی پلیٹیں۔''(۱۰)

ایران کا اسلامی انقلاب ۱۹۷۹ء میں واقع ہوا۔ اس انقلاب کے پیچھے کئی عوامی تحریکیں تھیں جو ایرانی معاشرتی، سیاسی اور مذہبی انتشار کے باعث اجتماعی اور اقتصادی تشدد کا باعث بن گئیں تھیں۔ مقامی عوام اور ادبیاتی، سیاسی اور مذہبی رہنماوں کا ایرانی شاہی حکومت کے خلاف احتجاج اور مختلف شدید ترین طبقات کا ایران کے حکمرانوں کے جواب دیتے رہنا، انقلابی تناظرات کو بڑھاوا دیتی رہیں۔

۱۹۷۹ء کے فروری میں، آیت اللہ خمینی نے ایران واپسی کا اعلان کیا اور اسلامی نظام کے قائم کرنے کیلئے احتجاجات کی تنظیم کی۔احتجاجات نے مزید اسلامی حکومت کا مطالبہ بڑھا دیا۔احتجاجات کے بعد، شاہ محمد رضا پہلوی نے ایران چھوڑنے کا فیصلہ کیااور ۱۶ فروری ۱۹۷۹ء کو ایران سے خفیہ طور پر برطانوی ہوائی جہاز میں سفر کیا۔اس کے بعد، آیت اللہ خمینی ایران میں واپس پہنچے اور انہوں نے اسلامی نظام کی قائم کرنے کی کوششیں کیں۔انقلاب کے بعد، اسلامی جمہوریہ قائم کی گئی، جہاں آیت اللہ خمینی سپریم لیڈر بنے اور اسلامی رہنماؤں نے حکومت کے مختلف حصوں کو عوامی قوتوں کے ساتھ تقسیم کیا۔ پاسداران انقلاب کی تشکیل کی گئی، جو انقلابی رہنماوں کو حفاظتی قوتیں فراہم کرتی

ہیں اور انقلابی نظام کی حفاظت کرتی ہیں۔ اسلامی جمہوریہ کے تشکیل کے بعد، ایرانی معاشی اور سیاسی نظام پر بڑا اثر پڑا۔ خصوصاً مذہبی تشدد، بین الاقوامی تعلقات میں تغیرات، ایرانی عوام کی آزادی کے معاشرتی حقوق پر اثرانداز ہوئے۔ علاوہ ازیں، ایران کی سیاست میں بھی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں جو علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر اثرانداز ہوئیں۔

فرخ سہیل گوئندی ایران کی سڑکوں پر ہونے والے انقلاب ایران کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> تہران کی سڑکیں اس دور میں مشرق وسطیٰ کے دیگر تیل پیدا کرنے والے ممالک سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھیں اور شہری نظام بھی۔ ساری عمارتوں کی دیواروں پر انقلاب کے متعلق مصوری اور آیت اللہ خمینی سمیت دیگر علماء کرام کے سینکڑوں فٹ چوڑے اور اونچے بینرز جا بجا لگے تھے۔ کہتے ہیں کہ انقلاب سے پہلے جو شہنشاہ کے مجسمے نصب تھے، وہ انقلاب اسلامی کی نذر ہو گئے۔ اب امام خمینی ہر موڑ پر بینر اور پوسٹروں کے ذریعے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو پا رہے تھے۔ کوئی شاہراہ یا چوک ان بینروں سے خالی نہیں پایا۔ (۱۱)

ایران میں تہران یونیورسٹی پر انقلاب کے بعد کئی اثرات دیکھے گئے ہیں۔ تہران یونیورسٹی انقلابی تحریک کا مرکزی میدان رہا ہے۔ اس جگہ پر طلباء نے شدید احتجاج کیا، جلوس نکالے اور مظاہرے کیے جو اسلامی انقلاب کا نمونہ قرار پائے۔ ان کی آواز نے انقلاب کو مضبوط کیا اور اس کی تیاری میں مدد فراہم کی۔ انقلاب کے بعد تہران یونیورسٹی نے سیاسی تبدیلی کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ طلباء نے جمہوریت، عدل، انصاف اور اسلامی نظام کے مطالبات پیش کیے اور اسلامی جمہوریہ ایران کی تشکیل میں حصہ لیا۔ انقلاب کے بعد تہران یونیورسٹی میں تعلیمی نظام پر بھی اثرات دیکھے گئے۔ تعلیمی نظام کو جدید اسلامی نظام کے مطابق تبدیل کیا گیا، علمی مضامین میں تبدیلیاں کی گئیں اور اسلامی تعلیمی نصابوں کو ترویج دیا گیا۔ ایران میں انقلاب کی ترویج کے لیے مختلف تحریکیں پروان چڑھیں جو ان میں طلبا کی تحریک بہت اہم ہیں۔ طلبا نے بڑھ چڑھ کر ان تحریکوں میں حصہ لیا۔

اس حوالے سے سبط حسن اپنی کتاب انقلاب ایران میں لکھتے ہیں:

> ایران کی قومی آزادی کی تحریک میں طلبا بالخصوص تہران یونیورسٹی کے طلبا برابر پیش پیش رہے ہیں۔۔۔۔ شاید ہی کوئی ایسا مہینہ گزرا جس میں ایران تہران یونیورسٹی کے کسی نہ کسی شعبے میں ہڑتال نہ ہوئی ہو۔ بعض اوقات تو یونیورسٹی کئی کئی مہینے بند رہی اور ہوسٹلوں کو بھی خالی کروالیا گیا۔۔۔ ایرانی طلبا کی جدوجہد اندرون ملک تک محدود نہ تھی بلکہ امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس غرضیکہ وہ جہاں کہیں بھی تعلیم پاتے تھے، شاہ کے جبر واستبداد کے خلاف پروپیگنڈہ اپنا قومی فرض سمجھتے تھے۔ (۱۲)

تہران یونیورسٹی انقلاب کے بعد سیاسی تجدید کا مرکز رہا ہے۔اس جگہ پر سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں،احتجاجات کی جگہیں بنیں اور سیاسی اجلاس منعقد کیے جاتے ہیں۔ تہران یونیورسٹی پر انقلاب کے بعد کئی دیگر تبدیلیاں بھی ہوئیں جو معاشرتی، ثقافتی، فکری، اقتصادی اور معاشی حیثیتوں پر اثرانداز ہوئیں۔ اسلامی انقلاب ایران کا سب زیادہ اثر ایران کی یونی ورسٹی پر ہوا۔ایران میں اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے تعلیمی درسگاہوں کو نشانہ بنایا گیا اور اوران کو تین سال کے لیے بند کر دیا گیا اور یہاں کے روشن خیال اور کیمونسٹ لوگوں کو تعلیمی اداروں سے فارغ کر دیا گیا۔

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں اس کی عکاسی اس طرح کی گئی:

> دانش گاہِ تہران جو انقلابِ اسلامی ایران ہی نہیں بلکہ مشرق وسطیٰ کی روشن خیال یونی ورسٹی جانی جاتی تھی، انقلابِ فرہنگی کے تحت مکمل طور پر اسلامائز کر دی گئی۔ مغربی افکار اور مغربی افکار رکھنے والے اساتذہ اور طلبا سے پاک کر دی گئی۔(۱۳)

فرخ سہیل گوئندی نے جب ایران کا سفر ایران کے دور انقلاب میں کیا۔وہاں کی عوام دو گروہوں میں منقسم تھی ایک جو پاسدارانِ انقلاب کہلاتے تھے اور دوسرے جو اس کی مخالفت میں تھے ۔پاسداران انقلاب یا" پاسداران جمہوری اسلام "ایران کے حامیوں اور فوجی طاقتوں کو کہا جاتا ہے جنہوں نے ایران کے اسلامی انقلاب کو پروان چڑھایا اور اسلامی جمہوریہ ایران کی بنیادیں رکھیں۔ پاسداران انقلاب نے انقلابی رہنماؤں جیسے آیت اللہ خمینی کے نظریات کی حمایت کی،ان کو مرکزی قوت بنایا۔وہ انقلابی طاقتوں کے نفاذ کی کوشش کرتے رہے اور اسلامی نظام کو مستحکم بنانے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔انھوں نے داخلی تنازعات کو دبایا اور بیرونی طاقتوں سے ملک کی حفاظت کی کوششیں کرتے رہے۔ پاسداران انقلاب کے اثرات کی سیاسی، اقتصادی، امن وامان اور سیاستی شعبوں میں وسعت رکھتے ہیں جبکہ انقلاب ایران کے مخالفین کی آراء ان سے مختلف تھیں بعض ایرانی آزاد خیال پسند یا مکتب فکر انقلاب ایران کی مخالفت کرتے تھے وہ ایک آزاد ماحول کے قائل تھے۔ وہ انقلابی رہنماؤں کو تشدد پسند قرار دیتے تھے۔ گوئندی صاحب اس کا تذکرہ مکالمے کی صورت میں کچھ یوں کرتے ہیں جو دوران سفر ان کا وہاں کی کچھ خواتین سے ہوا جس سے ان کے نظریات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

> "تم ایران کیا کرنے آئے ہو"
>
> میرا جواب تھا، "ٹورازم"
>
> ان میں سے ایک بلند قامت بارعب خاتون نے بے ساختہ کہا:
>
> "But we have mullaism"
>
> سب نے اس جملے پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا، ''اور میں اس ملاازم سے ٹورازم تلاش کرلوں گا۔ مجھے مختلف ملکوں کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور سماج میں دلچسپی ہے، اس کے علاوہ اور بہت کچھ''

میرے اس جواب پر چھ کی چھ سہیلیاں خوب محظوظ ہوئیں۔

بھورے رنگ دار بال کیے ہوئے ان خواتین میں سے ایک نے پوچھا، ''اور بہت کچھ سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''جی ملّا کا ایران، قبل از ملّا اور بعد از ملّا''خواتین کے ساتھ مکالمہ ذو معنی تو تھا پر پُر خطر بھی تھا۔

''تو دیکھتے چلے جاؤ، ملا کا ایران، ایک نظر آنے والا ایران ہے اور دوسرا جو زیادہ ہے نظر نہ آنے والا ایران ہے۔۔۔ اور یہ جو نظر آتا ہے ملّا کا ایران، مرگ بر امریکہ پر کھڑا ہے، حقیقت یہ کہ ملا کا ایران امریکہ پر کھڑا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں بنیاد پرستی کا پہلا طاقتور پودا، جس کے اثرات چہار سو پھیلیں گے۔ تیل سے مالا مال ملّا کا ایران جہاں جہاں اب کوئی ڈاکٹر مصدق جنم نہیں لے سکتے۔ سوشلسٹ، قوم پرست سب تمام ہوئے اب ہر طرف ملّا ہی ملّا ہے۔ دیکھتے چلے جاؤ۔۔''(۱۴)

بعض سماجی عوامل بھی زمانی انسلاک کا سبب بنتے ہیں۔ زمانی انسلاک عموماً کسی معاشرتی نظام یا قدرتی تغیرات کی وجہ سے واقع ہوتے ہیں۔ سماج کا تعلق اقتصادی، سیاسی، ثقافتی اور تاریخی عوامل سے منسلک ہوتا ہے۔ ملکی سطح پر ہونے والی تبدیلیاں زمانی انسلاک کا باعث بنتی ہیں۔ ملک میں سیاسی تغیرات اور ریاستی نظام میں تبدیلی یا حکومتوں میں تبدیلیاں ملکی نظام کا نقشہ تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایران بھی حکومتی سطح پر ایسی تبدیلی واقع ہوئی جس نے ملک کے نقشے کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ایران میں شہنشاہت کا خاتمہ اور اسلامی حکومت کا قیام پورے ملک کی صورتحال کو بدل کے رکھ دیا۔ گوندی صاحب نے نے اپنے سفر نامے میں بتایا کہ کیسے دونوں ممالک کے آپس کے مضبوط تعلقات تھے ۔ انقلاب سے قبل ایران میں رضاشاہ کی حکومت کا ہر طرف چرچا تھا تھا لیکن انقلاب کے بعد اسی شاہ سے سے جس کے سب حکم بجالاتے تھے اب لوگ اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ فرخ سہیل ایران میں سیاحت کے دوران محلات کی سیر کے دوران اس کا تقابل انقلاب کے بعد کی صورتحال سے کرتے ہیں اور اس کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں۔

محلات کے اس شاہی محل میں ایک وقت وہ بھی تھا جب یہاں محمد رضاشاہ پہلوی کی ملکیتی، دنیا کی مہنگی ترین کاروں کی قطاریں لگی ہوتی تھی۔ مشرق وسطیٰ کی سیاست کے کئی بڑے فیصلے انہی محلات کے اندر ہوئے۔ شہنشاہ ایران محمد رضا پہلوی بڑے غرور سے یہاں اپنے ملک پر حکمرانی اور مشرق وسطیٰ پر اپنارڈر قائم کیے ہوئے تھا۔ امریکی امپیریل ازم کا سب سے بڑا مہرہ جو مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی شطرنج الٹ جانے کی طاقت رکھتا تھا۔ اس کی دھاک چار سو تھی۔ لوگ اس شہنشاہ کی جھلک دیکھنے کو ترستے تھے۔(۱۵)

عصمت انونو جمہوریہ ترکی کے بانی کمال پاشا اتاترک کے بعد ۱۱ نومبر ۱۹۳۷ء کو دوسرے صدر منتخب ہوئے اور ۱۴ مئی ۱۹۵۰ء تک صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے اپنے عہد میں بہت سے اہم کام کیے جس کے اثرات ترکی پر دیرپا تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سکندرون اور نطاکیہ کے ساحلی اضلاع جو شام کے پاس تھے ان پر ترکوں کا دعویٰ تھا کہ یہ علاقے ان کے حصے میں آتے ہیں۔ عصمت انونو نے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی اور یہ علاقے ترکی میں شامل کرادیئے۔ پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کو بہت سارے نقصانات برداشت کرنا پڑے اس بنا پر دوسری جنگ عظیم میں عصمت انونو نے کے تدبر اور ان کی کاششوں کے سبب ہی ترکی نے جنگ میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ اس کے بعد انھوں نے ان اہم جلا وطن رہنماؤں کو واپس بلا لیا جنھیں اتاترک نے ملک بدر کر دیا تھا۔ عصمت انونو نے زرعی اصلاحات کے لیے ایک اہم کام یہ کیا کہ انھوں نے زرعی اصلاحات کا نفاذ کیا جس کے تحت زمین کے بڑے ٹکڑے معاوضہ دے کر خریدے اور انھیں چھوٹے کاشتکاروں میں تقسیم کیا جن سے دیہی علاقے خوشحال ہوئے۔ عصمت انونو نے اپنے دور حکومت میں جو اصلاحات کیں ان کے اثرات دیرپا تھے۔ فرخ سہیل نے جب ترکی کا سفر کیا تو تب ۱۹۸۳ء میں عصمت انونو کی اصلاحات کے اثرات نمایاں تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> عصمت انونو سوویت یونین کی پانچ سالہ منصوبہ بندی سے بڑے متاثر تھے۔ اسی Statism کی بنیادی پالیسی کے تحت عصمت انونو نے ترکی میں قومیانے (Nationalization) پر سختی سے عمل کیا۔ پھر زرعی اصلاحات جن کا اثر آج تک قائم ہے کہ ترکی میں زرعی زمین زیادہ سے زیادہ پانچ سے دس ایکڑ فی فرد زیادہ نہیں اور آج بھی ترکی میں زرعی زمین کا بیشتر حصہ حکومت کی ملکیت ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے جاگیرداروں اور جاگیرداری کا خاتمہ کیا اور انہی اصلاحات کے ردِ عمل میں ترکی کے جاگیرداروں اور بینکاروں نے نئی پارٹی، ڈیموکریٹک پارٹی بنائی۔۔۔۔ آج ۱۹۸۳ء میں جو ترکی ہے، اس میں اگر ریاست کے تحت معاشی اصلاحات نہ ہوتیں تو ترکی کب کا بکھر گیا ہوتا۔[۱۶]

ایران کا شمار اسلامی ممالک کی فہرست میں ہوتا ہے یہاں زیادہ آبادی مسلمانوں کی آباد ہے۔ ان میں زیادہ تر کا مسلک شیعہ ہے۔ ایران وہ جگہ ہے جہاں پوری دنیا کے اہل تشیع کے دل بستے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں امام رضاؑ کا روضہ مبارک ہے اس کے علاوہ بی بی شہر بانو اور امام زادہ سید حمزہ کے مزار ہیں۔ یہاں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں پوری دنیا سے اہل تشیع زائرین یہاں کی زیارت کرنے آتے ہیں۔ امام علی رضاؑ کا مزار ایران کے شہر مشہد میں جو واقع ہے۔ یہ آٹھویں امام کی آرام گاہ اور ایک عظیم الشان عبادت گاہ ہے۔ اسے ایران کی سب سے بڑی مسجد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ رے شہر ایران کا تاریخی شہر ہے۔ یہاں کئی اولیا جیسے بی بی شہر بانو اور شاہ عبدالعظیم دفن ہیں۔ اس شہر کی

قدامت پانچ ہزار سال پرانی بتائی جاتی ہے۔بی بی شہر بانو نبی پاک ﷺ کے نواسے امام حسینؓ کی زوجہ محترمہ اور امام زین العابدینؓ کی والدہ تھیں۔ شہر بانو کا شیعہ، سنی ہر مسلک میں احترام کیا جاتا ہے خاص طور پر ایران میں ان کی بہت تعظیم کی جاتی ہے۔ان کے مزار پر آنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ان کے مزار کو بہت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔فرخ سہیل گو ئندی صاحب نے دوران سفر بی بی شہر بانو کے مزار پر حاضری دی وہاں زائرین کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی جس میں پاکستان سے آئے پنجابی بھی شامل تھے،اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

> بی بی شہر بانو کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ پاکستانی ہی پاکستانی، سیاہ شلوار قمیصوں اور سیاہ چادروں میں ملبوس پاکستانی زائرین کا ایک قافلہ زیارت کے لیے ادھر موجود تھا، بلند آواز میں بولتے اور یا علیؓ، یا حسینؓ کے نعرے لگاتے پنجابی، نیچے دو بسیں کھڑی تھیں، جو لاہور سے یہاں تک آئیں۔ بسوں کا معیار بیدیاں گاؤں لاہور کی طرف چلنے والی بسوں سے زیادہ بہتر نہ تھا۔ دیگر اقوام کے زائرین بھی موجود تھے مگر جو ''روحانیت'' ان پنجابی زئرین نے دکھائی، وہ سب سے مختلف تھی۔اونچی آواز میں گفتگو، علیؓ اور حسینؓ کے نعرے۔ بیمار زین العابدین اور شہدائے کربلا کے ذکر کرتے نوحہ کناں۔ (۱۷)

ان مذہبی شعائر سے اہل ایران کی دلچسپی اور عقیدت کو نا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کا بیان بھی بڑی عمدگی سے ملتا ہے۔شاہ عبدالعظیم بن علی بن حسن بن زید بن علی بن ابی طالب شاہ عبدالعظیم حسنی کے نام سے معروف ہیں۔ ان کا شمار سادات کے علما اور علم حدیث کے راویوں میں ہوتا ہے۔ان کا نسب چار پشتوں کے بعد امام حسن مجتبیٰؓ سے جا ملتا ہے۔انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ دینی امور اور علم حدیث کے لیے وقف کر دیا اپنے دور کے اہم مجتہد اور عالم انسان تھے۔ آپ ایک پرہیز گار انسان تھے جنھوں نے اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی۔آپ نے پانچ آئمہ کا دور دیکھا،امام کاظمؑ کے دور سے لے کر امام عسکریؑ کے دور تک زندہ رہے۔آپ کی پیدائش مدینہ منورہ میں ہوئی،عباسی خلیفۃ المتوکل کے ظلم سے بچنے کے لیے امام علی نقیؑ کے کہنے پر آپ نے ایران کے شہر رے کی طرف ہجرت کی اور پھر چند سال بعد آپ نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔آپ کا مزار اسی شہر میں ہے۔آپ کے مزار پر ہر سال لاکھوں زائرین تشریف لاتے ہیں اور آپ کے مزار کو بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔آپ کے مزار سے لوگ روحانی طور پر منسلک ہیں اور ایک جذباتی رویہ رکھتے ہیں۔ گو ئندی صاحب شاہ عبدالعظیم کے مزار اور وہاں آنے والے زائرین کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

> امام زادہ شاہ عبدالعظیم کے مزار کا سنہری گنبد،امام حسینؓ کے مزار کے گنبد کی طرز پر ہے اور اندر سونے چاندی سے لدا ہوا ہے۔دیواروں اور چھت پر شیشہ کاری مزار کے اندر لگے بلبوں سے مزید روشن ہو جاتی ہے۔ میں ان کے مزار کے پہلو میں دعا مانگ رہا تھا اور شیخ صاحب روضے کی جالی کو

> چوم چوم کر روئے جارہے تھے۔ گناہوں کی بخشش اور کاروبار میں برکت، سارے گھر والوں کی خیر۔ مولا مینوں (مجھے) معاف کرے۔ اے میرے مولا، مولا علی دے صدقے، دعا مانگتے ہوئے شیخ صاحب کی آواز دیگر زائرین کی توجہ میں خلل پیدا کر رہی تھی۔ مگر ان کا انداز رقت آمیز تھا۔ التجا، فریاد، آہ وزاری۔ (۱۸)

سیاسی واقعات زمانی انسلاک کا باعث بنتے ہیں۔ سیاسی تغیرات، جیسے کہ حکومت کا تبدیل ہونا یا قومی انتخابات اور ملک میں مارشل لاء کا نفاذ زمانی انسلاک کا باعث بن سکتے ہیں۔ نئ حکومت کی آمد، طبعی آفات، اقتصادی مسائل وغیرہ سیاسی تغیرات کا سبب بنتے ہیں کیونکہ ان مسائل کا سامنا عوام اور حکومت دونوں کرتی ہیں۔ یہ سیاسی تبدیلیاں زمانی انسلاک کی وجہ بنتی ہیں۔ سیاسی مسائل جیسے رشوت خوری اور بدعنوانی ایک ملک کے سیاسی نظام کو تباہ کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں، حکومت کو بحرانات کا سامنا ہونے کی وجہ سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو زمانی انسلاک کی وجہ بنتے ہیں۔ جنرل کنعان ایورن نے ۱۹۸۰ء میں بحیثیت فوجی جنرل مارشل لاء لگا کر حکومت کو گرا دیا اور پھر نو سال تک مسلسل ملک کی صدارت کرتے رہے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء میں لگایا گیا، یہ مارشل لاء ترکی کی تاریخ کا سب سے خونی دور کہلاتا ہے اور اس عرصے میں فوج نے سیاست پر غلبہ حاصل کیے رکھا۔ انھوں نے اپنے دور حکومت میں ہونے والے فوجی انقلاب اور سیاسی کارکنان پر تشدد اور انھیں دی جانے والی پھانسیوں کا دفاع کیا۔

فرخ سہیل اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ترکی میں جنرل کنعان ایورن کا بے رحم مارشل لاء ایک جانب اپنی بے رحمی سے متعارف ہوا تو دوسری جانب معاشی، اقتصادی اور دیگر قومی اصلاحات کے حوالے سے، جس میں امن کا قیام سرفہرست ہے۔ کنعان ایورن نے علیحدگی پسند کُردوں اور مختلف مسلح گروہوں کے خلاف بے رحم اقدامات اٹھائے۔ اس دوران بائیں بازو کے مختلف دھڑوں کے خلاف کنعان ایورن نے سخت گیر فیصلے کیے۔ ان کے مارشل لاء میں جبر کا بڑا نشانہ عملاً بائیں بازو کے مختلف دھڑے اور تنظیمیں تھیں۔ کنعان ایورن نے ترگت اوزال کی شکل میں دوسری طرف معیشت کی بحالی کا ایک مسیحا فراہم کر دیا اور یوں ترکی میں کنعان ایورن کے مارشل لاء کے دوران ایک نئے معاشی انقلاب کا آغاز ہوا۔ (۱۹)

ترکی کے جنرل کنعان ایورن نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور اس کی وجہ بلند ایجوت اور سلیمان ڈیمرل کے سیاسی تنازعات کو قرار دی۔ اس نے ملک میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ مارشل لاء نافذ کر کے انھوں نے ترکوں، علاحدگی پسند کردوں اور مختلف مسلح گروہوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ اس سے قبل جنرل ضیاء الحق ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ملک پاکستان میں مارشل لاء لگایا۔ جنرل ضیاء الحق نے احتجاجوں، سیاسی بدامنی، معاشی بحران

اور اخلاقی انحطاط کو جواز بنا کر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو گرا کر مارشل لاء لگایا اور بعد میں صدارت کا عہدہ سنبھالا۔ فرخ سہیل نے اپنے ملک کے مارشل لاءاور ترک مارشل لاء کا تقابل بھی کیا۔ وہاں کے مارشل لاء کو انھوں نے اپنے ملک کے مارشل لاء سے بھی بدتر پایا جہاں ہر طرف فوجی بنوق کے ٹریگر پر انگلی رکھے لوگوں کو ہراساں کرتے نظر آتے ہیں۔

دوغبایزیت کی گلیوں میں ترک فوجی دستے ،ارچ پاسٹ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے، پریڈ کا مظاہرہ دیکھنے والے منتشر ہونے لگے اب گلیوں کے نکڑوں پر لمبے تڑنگے فوجی سپاہی جدید آٹومیٹک بندوقیں تانے کھڑے نظر آئے۔ سب کی انگلیاں اپنی اپنی بندوق کے ٹریگر پر تھیں۔ یہ مارشل لاء حکومت کی طرف سے مامور تھے۔

ترک مارشل لاء کا یہ انداز میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ گلی گلی، شہر شہر، قصبہ قصبہ فوجی جوان بس گولی چلانے کے لیے تیار انداز میں چاک وچوبند تیار کھڑے پائے۔ [۲۰]

مصطفٰی کمال پاشا ترکی کے قومی ہیرو اور رہبر تصور کیے جاتے ہیں۔ ۱۰ نومبر کو ان کا دن یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ انھوں نے ترکوں کو سلطنت عثمانیہ سے آزاد کرایا اور ترکی میں سیاسی، اقتصادی اور سماجی حوالے سے جدید اصلاحات قائم کیں۔ ان کے دن کو ترک خصوصی طور پر مناتے ہیں۔ اس دن کو ترک ریاستی تقریبات، جشن اور تعلیمی اداروں میں تقریبات کا انعقاد کر کے مناتے ہیں۔ ترک عوام کو اس دن یکجہتی، احترام اور وفاداری کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ اس دن سرکاری دفاتر، تعلیمی اداروں اور عوامی سطح پر خصوصی تقریبات اور پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں، اس روز خصوصی طور پر ترکی کے پرچم بلند کیے جاتے ہیں۔ ترک عوام اس دن کا احترام کرتی ہے اور اپنے قومی ہیرو کے کارناموں کو یاد کرتی ہے۔ ترک قوم اپنے باپ اور قائد اتاترک سے بہت محبت اور احترام کرتی ہیں۔ اور ان کے انتقال کے دن کو بہت ادب اور احترام کے ساتھ مناتی ہے۔ جس وقت مصطفٰی کمال پاشا اتاترک کی روح نے پرواز کیا اس وقت پورے ترکی میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس انداز کو میں ہوں جہاں گرد میں یوں بیان کیا گیا۔

ترکیہ جمہوریہ کے بانی غازی مصطفٰی کمال پاشا اتاترک کی روح نے اس کمرے سے ملک عدم کی جانب پرواز کی۔۔۔۔ ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کی صبح نو بج کر پانچ منٹ۔ میز پر رکھی گھڑی اس طرح رکھی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں اسی وقت پہ ساکت کر دی گئیں ۹ بج کر ۵ منٹ۔ آج بھی ہر سال ۱۰ نومبر کو ترکی میں جب اتاترک کے انتقال کے دن کو منایا جاتا ہے تو سارے ترکی میں دفتروں میں نو بج کر پانچ منٹ پر لوگ باادب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چلتی ٹریفک جہاں ہو وہیں رک جاتی ہے حتٰی کہ پیدل چلتے لوگ بھی رک جاتے ہیں ۔ ریڈیو، ٹیلی وژن اپنی نشریات مکمل طور پر بند کر دیتے ہیں۔ [۲۱]

ترکی کی حکومت میں فوجی نظام نے اپنا منفرد کردار ادا کیا۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد سے ترکی پر فوج کی گرفت کسی نہ کسی صورت رہی ہے۔ ریاستی سطح پر ترکی میں فوج کے کردار کی ابتدا مصطفی کمال پاشا اتاترک اور عصمت انونو کے دور میں ہوئی۔ مصطفی کمال نے ترکی کو عثمانی خلافت سے آزاد کروایا۔ انھوں نے ترکی کے مقبوضہ علاقے آزاد کروانے کے ساتھ ساتھ ترکی کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے ترکی میں اصلاحات کے ساتھ اس کو جدید بنیادوں پر استوار کیا۔ ترکی میں سیکولرازم کی بنیاد ترک فوج نے رکھی۔ ترکی میں مختلف ادوار میں فوج کے جرنیلوں نے یہاں مارشل لاء لگائے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۷ء میں سلیمان ڈیمرل نے انتخابات کے دوران حالات خراب ہونے کی وجہ سے مارشل لاء لگا دیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں جنرل کنعان ایورن نے سلیمان ڈیمرل اور بلند ایجوت کے تنازعات کو جواز بنا کر مارشل لاء لگا دیا۔ کنعان ایورن نے جب مارشل لگایا تو پورے ملک پر ایک خوف اور دہشت طاری تھی اور جنرل کنعان ایورن کے فوجیوں نے عوام کے ساتھ سخت رویہ برتا اور ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ فرخ سہیل کے سفر کے دوران ترکی میں یہی حالات تھے جن کے وہ عینی شاہد ہیں، لکھتے ہیں۔

> بالکل سامنے ٹورسٹ آفس کے ساتھ فوجی بکتر بند گاڑیاں یوں کھڑی تھیں جیسے یہ سیاحتی میدان نہیں بلکہ کوئی میدان جنگ ہے اور دائیں بائیں بندقیں تانیں، ٹریگر پر ہاتھ رکھے فوجیوں کی ٹولیاں گشت کر رہی تھیں۔ کنعان ایوران کا مارشل لاء جگہ جگہ دیکھا جا سکتا تھا، یعنی جہاں جہاں ترکی وہاں مارشل لاء کی دہشت۔ [۲۲]

ترکی میں ریلوے کا ایک وسیع نظام موجود ہے۔ ترکی میں ریلوے نیٹ ورک کی تعمیر انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں شروع ہوئی۔ ترکی کی پہلی ریلوے لائن استنبول اور ادرنہ کے درمیان بنائی گئی جس کا افتتاح ۲۲ ستمبر ۱۸۵۶ء میں ہوئی۔ ترکی کے ریلوے نیٹ ورک کو برطانوی کمپنی نے ابتدائی طور پر منظم کیا بعد ازاں ترک حکومت نے ریلوے کے نظام مضبوط بنایا اور اپنی کئی کمپنیاں تشکیل دیں۔ ٹرین کی سروس کو بحال رکھنے اور اس کو ترقی دینے کے لیے مستقل اقدامات اٹھائے گئے اور نئے پروجیکٹس کے ذریعے ریلوے لائنز کا جال پورے ترکی میں بچھایا گیا۔ جس دور میں مصنف نے ترکی کا سفر کیا اس دوران وہاں ریلوے کا نظام وسیع پیمانے پر قائم تھا لیکن اس دور کے بعد وہاں کی عوام نے ریلوے کا ترجیح دی۔

ترکی کے ریلوے سسٹم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> دو دو ایکپریس کوئی ہائی کلاس ٹرین نہیں تھی، مگر ہماری ٹرینوں سے کہیں معیاری۔ ترکی میں ان دنوں اس قدر ٹرین پر سفر کا رواج نہیں تھا۔ کئی سال بعد مسافروں نے ٹرینوں میں سفر کرنے کو ترجیح دی جبکہ پاک و ہند کی ٹرین، دنیا کی اولین ریلوے نظام میں شمار ہوتی ہے۔ میں نے اسی سفر میں پاکستان ریلوے کے ملازمین کو بھی ترکی کا سفر کرتے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ دونوں ممالک کی ریلویز کے درمیان اپنے تجربات

> باٹنے کو معاہدہ ہے۔ کن دنوں میں جہاں گردی کر رہا تھا، انہی دنوں ہمارا ریلوے نظام دیگر ریاست اداروں کی طرح مائل بہ زوال اور ترکی کا محدود ریلوے نظام جرمنوں کے مرہون منت ہے اور یہ ٹریک توروسیوں نے ترکی سے رابطے کے لیے بچھایا تھا۔ زار روس کے زمانے میں ٹرینیں ادھر قارص تک آنا شروع ہو گئیں تھیں۔ ترکی میں انقلاب ۱۹۲۳ء کے بعد ریلوے کو مزید ترقی کی جانب لے جایا گیا مگر ترک بنیادی طور پر بسوں کے مسافر ہیں۔ اسی لیے ارضِ روم سے انقرہ تک بس کا ٹکٹ ٹرین کے مقابلے میں مہنگا تھا۔ مگر میرے لیے یہ ٹکٹ سستا اور سفر شاہانہ تھا۔ اگر ٹرین کا ٹکٹ بس سے مہنگا ہوتا تو بھی میں اس ٹریک پر لازمی سفر کرتا۔[۲۳]

کرد کردستان میں بسنے والوں کے لیے استعمال کی جانے والی اصطلاح ہے، یہ لوگ زیادہ تر ترکی، شام، ایران اور عراق کی سرحدں میں رہتے ہیں۔ کرد اپنی آزادی کے لیے اپنی آواز بلند کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی آواز کو دبا دیا جاتا ہے۔ عبداللہ او جلان، تحریک کردستان کے بانی اور رہنما ہیں۔ تحریک کردستان، جسے عام طور پر کردستان ورکرز پارٹی (PKK) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ایک کردستانی عسکری سیاسی تنظیم ہے جو کردوں کے قومی حقوق اور آزادی کے لیے کام کرتی ہے۔ تحریک کردستان کا مقصد کرد عوام کو آزادی دلوانا ہے ہے۔ عبداللہ او جلان کردوں کی آزادی کے حامی ہیں اور اس تحریک کا مقصد کردوں کے لیے آزاد خود مختار ریاست کا قیام ہے۔ وہ کردستان میں کردوں کی اپنی سیاسی، معاشی اور ثقافتی پہچان کے خواہش مند ہیں۔ عبداللہ او جلان نے کئی بار صلح اور مذاکرات کی کوشش کی ہے لیکن اس پر کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ عبداللہ او جلان نے تحریک کردستان ۱۹۷۸ء میں تشکیل دی تھی۔ او جلان کی قائم کردہ تنظیم ''کردستان ورکرز پارٹی'' نے ۱۹۸۴ء میں ترکی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اس تحریک کا مقصد کردستان کی آزادی اور خود مختاری ہے۔

فرخ سہیل نے جب ترکی کا سفر کیا تو وہاں یہ تحریک زوروں پر تھی انھوں نے اس کا مشاہدہ کیا اور اس کا ذکر اپنے سفر نامے میں یوں کرتے ہیں:

> ارضِ روم تک پہنچنے تک میں نے ترک ریاست کی مضبوط رِٹ کا جو مشاہدہ کیا، وہ ایک اہم اور پہلا تجربہ تھا۔، خصوصاً ایسے علاقے کا سفر جہاں علیحدگی کی تحریک نے ابھی تازہ تازہ دوبارہ جنم لیا تھا۔ کردستان کی علیحدگی کی تحریک۔ اس تحریک کا بانی عبداللہ او جلان ہے۔ مارکسٹ، لیننسٹ، علیحدگی پسند، پارٹیہ کارکنانِ کردستان۔ (کردستان ورکرز پارٹی، پی کے کے)۔[۲۴]

کرد عوام ایران، ترکی، ایران اور شام میں بستی ہے۔ کرد عوام اپنے الگ وطن کے حصول ہمیشہ سے اپنی آواز بلند کرتی آرہی ہے لیکن ان کی آواز کو دبا دیا جاتا ہے مختلف ادوار میں ان کی زبان اور ان کے رہن سہن پر پابندیاں عائد کی جاتی رہیں۔ ترک حکومت اور کردوں کے درمیاں ہمیشہ سے معرکہ آرائی رہی ہے۔ ترکوں کی سب سے مضبوط پارٹی

اور تحریک پی کے کے نے سب سے زیادہ ترکی کی معیشت کو نقصان پہنچایااس لیے ترک حکومت کردستان پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ ترکی میں کردوں کے ساتھ مختلف نوعیت کے تنازعات سر اٹھاتے رہتے ہیں جن میں تاریخی تنازعات اہم ہیں جن میں کرد نے اپنے مطالبات پیش کیے کہ انھیں علاحدہ مملکت دی جائے جس میں وہ اپنے سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کی حفاظت کر سکیں لیکن حکومتی پالیسیوں نے اسے رد کر دیا۔ ترکی کے اندر کردوں کے ساتھ موجود مختلف سیاسی مسائل دونوں کے درمیاں کئی تنازعات کا باعث بنتے ہیں۔ فرخ سہیل سیاحت کے دوران جب کردوں کے علاقے میں داخل ہونے لگے تو ان پر اور ان کے ساتھ موجود دیگر لوگوں پر کڑی نظر رکھی گئی اور ان کی تلاشی کے دوران سختی برتی گئی۔ فوج اور ملیشیا نے اس دور میں جس طرح ملک پر کنٹرول کر رکھا تھا اور عوام کو جن سختیوں کا سامنا تھا۔ فرخ صاحب نے اس کا مشاہدہ بھی کیا۔ حالات کی سنگینی ان کے قلم سے عیاں ہوتی نظر آتی ہے اُنھوں نے اس دور میں ملکی نظم وضبط کو برقرار رکھنے اور اور حالات پر قابو پانے کے لیے مارشل لاء اور حکومت کے جابرانہ ہتھکنڈوں کو بھی عیاں کیا ہے۔ فوج نے کردوں کے علاقے میں خصوصاًجو سختیاں برتی تھیں اس کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے جیسے لکھتے ہیں:

> یکا یک دیکھا تو فوج اور ملیشیا کا ایک سخت ناکہ تھا۔ ہم سے پہلے چند ٹرالیوں اور گاڑی سواروں کی باقاعدہ چیکنگ ہو رہی تھی۔ جب ہماری باری آئی تو اسلحہ سے لیس ایک اونچا لمبا سرخ و سفید نوجوان ترک فوجی بس میں داخل ہوا۔ انجن بند کر دیا گیا۔ اس نے ترک زبان میں کنڈ کٹر کو کچھ ہدایت دی اور ڈرائیور نیچے اتر گیا۔ کنڈ کٹر نے سب مسافروں کے شناختی کارڈ اور میرا پاسپورٹ لیا۔ اور اکھٹے کر کے نیچے ناکے لگائے فوجیوں اور ملیشیا کے پاس چلا گیا۔ اس دوران مزید فوجی بس میں سوار ہوئے اور سب کو گھور کر "ایکسرے" کرنا شروع کر دیا۔[۲۵]

ارارات (Ararat) ترکی میں واقع سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ اسے کوہ ارارات بھی کہا جاتا ہے اس کی بلندی ۵۱۳۷ میٹر ہے۔ یہ پہاڑ ترکی میں ایران اور آرمینیا کی سرحد کے قریب واقع ہے، یہ ایک آتش فشانی پہاڑ ہے اور آخری بار ۱۸۴۰ء میں پھٹا تھا۔ اس کی سرحدیں ایران اور آرمینیا سے ملتی ہیں لیکن آتش فشاں پہاڑ سارا ترکی میں واقع ہے۔ کوہ ارارات ترکی، ایران اور روسی آرمینیا کے درمیان سرحدوں کے نشان کے طور پر کام کرتا ہے، لیکن یہ پورا علاقہ ترکی کی حدود میں واقع ہے۔ قدیم روایت کے مطابق طوفان کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی اس پہاڑ کی چوٹی کے ساتھ رکی تھی۔ یہ پہاڑ دو چوٹیوں پر مشتمل ہے۔ آخری بار آتش فشانی ۱۸۴۰ء کے بعد اب اس کی چوٹیاں زیادہ تر برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ اس کے ارد گرد کے وسیع میدانوں میں گھاس اگتی ہے جہاں کرد قبائل اپنی بھیڑیں چراتے

ہیں۔اس کی سرحد کی دوسری طرف ایران اور آرمینیا کی سرحدیں ہیں جنھیں دیکھنے کے لیے فرخ سہیل نے وہاں کا سفر کیااور انھوں نے سرحد کی دوسری طرف واقع روسی آرمینیا کی سرحد کا تذکرہ وہ اس طرح کرتے ہیں۔

> ارارات کے اس طرف آرمینیا ، سوویت سوشلسٹ ریپل جس کا دارالحکومت یریوان(Yerevan) ہے جسے دنیا کی قدیم اور مسلسل آباد بستیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یریوان ارارت کے میدان پر آباد اس خطے کا سب سے بڑا شہرہ۔ میں ارارت کے اس طرف Ararat plainپر کھڑا تھا۔ آرمینیوں کو ارارات سے اس قدر تہذیبی و مذہبی لگاؤ ہے کہ سوویت یونین کی اس جمہوریہ کے سرکاری لوگو میں بھی ارارات تھا۔ آرمینیا سوشلسٹ ریپبلک کے سرکاری نشان میں گندم کے خوشے اور انگور کی بیلیں، زیتون اور درمیان میں نمایاں طور پر ارارت پہاڑ تھا اور اس کے اوپر اشتراکی روس کا قومی نشان ہتھوڑا اور درانتی تھا۔ ارارت کے سوویت یونین کی ریپبلک آرمینیا کے سرکاری لوگو پر ترکی کو اعتراض ہوا کہ یہ پہاڑ تو ہماری مملکت کے اندر ہے بھلا آپ کیسے اسے جمہوریہ آرمینیا کے سرکاری لوگو پر استعمال کر سکتے ہیں۔ ترکی نے سرکاری طور پر سوسیت یونین سے اس پر احتجاج بھی کیا۔
>
> اس پر سوویت یونین نے جواب دیا:
>
> ''آپ کے جھنڈے پر چاند اور ستارا ہے تو کیا وہ آپ کی ملکیت ہے اور کیا وہ آپ کے ہاں موجود ہے؟''[۲۶]

کسی ملک کے تجارتی مراکز وہاں کے لوگوں کی دلچسپیوں مشاغل اور طرزِ زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ لوگوں کا بود و باش طرزِ زندگی کیسا ہے کون سی اشیا ان ترجیحات میں اولیت رکھتی ہیں۔فرخ صاحب نے جس ملک کی سیاحت کی وہاں کے تجارتی مراکز کا بھی کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ ذکر اس قدر دلچسپ ہے کہ اس میں گرینڈ بازار کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تاریخی اہمیت بھی بتائی ہے تاریخی و ثقافتی نیز معاشی نقطہ نظر ترکی کے بارے میں معلومات افزا سفر نامہ کہا جا سکتا ہے۔ ترکی کے شہر استنبول میں واقع گرینڈ بازار دنیا کا سب سے بڑا، قدیم اور تاریخی بازار ہے۔اس کی بنیاد عثمانیوں کے دور میں سلطان محمد ثانی نے رکھی۔ گرینڈ بازار میں اکسٹھ گلیاں اور مختلف اشیا کی تقریباً پانچ ہزار سے زائد دکانیں ہیں۔اس کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اوپر سے مکمل طور پر بند ہے، یہ بازار عثمانیوں کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سیاحوں کے لیے خصوصی دلچسپی رکھتا ہے اور پوری دنیا سے آنے والے سیاح یہاں ضرور آتے ہیں۔ کبھی کبھی یہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔اس بازار میں ترکی کی روایتی چیزیں باآسانی مل جاتی ہیں ۔اس بازار کی ایک خصوصیت یہاں کی کچھ ایسی دکانیں موجود ہیں جو صدیوں سے اپنی روایات برقرار رکھتے ہوئے وہی مصنوعات فروخت کر رہی ہیں۔ ترکی کا یہ بازار قدامت اور جدت کا

بہت خوبصورت امتزاج ہے جو سیاحوں کے لیے خصوصی کشش رکھتا ہے۔اس بازار میں عثمانی عہد سے لے کر عہد جدید تک ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے۔میں ہوں جہاں گرد کے مصنف استنبول کے گرینڈ بازار میں سیاحت کے دوران اس کا تقابل ایران کے بازار بزرگ سے کرتے ہیں، لکھتے ہیں۔

> استنبول کے گرینڈ بازار میں داخل ہوا تو مجھے لگا کہ تہران کے بازار بزرگ میں آگیا ہوں۔ان دونوں بازاروں میں ناموں کا بھی فرق نہیں۔صرف دونوں زبانوں کا ہے۔۔۔۔استنبول کے اس صدیوں پرانے تاریخی گرینڈ بازار کی ۶۴ گلیاں اور ۲۲ دروازے ہیں۔ہر طرف رنگ برنگی مختلف اشیاسے سجا ہوا بازار پایا۔گرینڈ بازار میں سیاحوں کے غول امڈے چلے آرہے تھے، مختلف سیاحوں کے غول اپنے ''سیاحتی رہنماؤں'' کی قیادت میں باادب ان کی پیروی کر رہے تھے۔اطالوی سیاحوں کے غول، برطانوی، ہسپانوی، امریکی، جرمن، فرانسیسی، جاپانی ہر قسم کے سیاحوں کے غول۔۔۔[۲۷]

جنگی واقعات زمانی انسلاک کا باعث بن سکتے ہیں۔جب کسی ملک میں جنگ یا بدامنی کی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو اس کے اثرات وہاں کی عمومی زندگی تجارت، تعلیم وغیرہ پر بھی ہوتے ہیں۔انسانی تاریخ میں کئی جنگی واقعات ہوئے ہیں جو زمانی انسلاک کا سبب بنے ہیں۔جیسے جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی وجہ سے بھی زمانی انسلاک پیدا ہوتا ہے۔اس دور کے ادب میں دیکھا جائے تو اس میں اس دور کی پوری تاریخ نظر آتی ہے۔جیسے مرزا غالب کے کلام کی مثال لیجیے اس میں اس دور کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔تقسیم ہند کے دوران ہونے والی تباہی اور حالات و واقعات کی مکمل تصویر اس دور کے ادب میں ملتی ہے۔جنگی واقعات عموماً ممالک کی معیشت، تجارت، تمدن، سیاسی نظام اور دیگر اقتصادی اور اجتماعی عوامل پر اثرانداز ہوتے ہیں جو زمانی انسلاک کو پیدا کرتے ہیں۔انسانی تاریخ میں جنگی واقعات کی اثرات دیر پا تک محسوس کیے جاتے ہیں۔۱۹۸۳ء میں گوئندی نے ترکی کا سفر کیا، ۱۹۷۴ء میں قبرص میں ہونے والی جنگ کے اثرات نمایاں تھے جنھیں انھوں نے محسوس کیا اور اس کا ذکر ان کے سفر نامے میں ملتا ہے۔

> ہمارے اخبارات میں ان دنوں دو ممالک میں خانہ جنگی کی خبریں سرخیاں بن کر شائع ہوتی تھیں۔
> لبنان میں خانہ جنگی...
> قبرص میں خانہ جنگی...
> قبرص میں صدیوں سے آباد ترک اور یونانی ایک طویل خانہ جنگی کا شکار تھے۔آئے روز یونان وہاں آباد یونانیوں کی سرپرستی کرتے ہوئے ترک قبرصیوں کی نسل کشی کر رہا تھا اور پھر ایک روز وہاں

ترک افواج کے اترنے کی خبر ہمارے اخبارات کی شہ سرخی بنی۔اس طرح قبرص ہے ۳۷ فیصد حصے پر ترک افواج نے کنٹرول قائم کر لیا۔[۲۸]

ملکی حالات بھی زمانی انسلاک کا باعث بن سکتے ہیں جیسے طبعی حالات و واقعات (قدرتی آفات)، سیاسی عدم استحکام، اقتصادی مسائل ملک میں امن امان کی تباہی وغیرہ زمانی انسلاک کا حصہ بنتے ہیں۔ بعض اوقات حکومتوں کی تبدیلی سے پورا ملکی نظام متاثر ہو جاتا ہے۔ جیسے ایران میں شہنشاہت کا خاتمہ ہوا انقلاب برپا ہوا اور ترکی میں آٹھ سو سالہ عثمانیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا فوج بر سرِ اقتدار آئی۔اس طرح کے واقعات ملکی تاریخ کو پلٹ کرر کھ دیتے ہیں اور ملک میں ایک نئی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ترکی میں سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ اور اتاترک کی حکومت کے آمد سے ملک میں کئی تغیرات آئے جس سے ترکی میں عظیم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ملکی سطح پر عظیم تبدیلیاں س حوالے سے اہم ہیں کمال اتاترک نے وسیع تبدیلیوں کو پیش نظر رکھا اور بہت سے اقدامات کیے سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد، مصطفی کمال پاشا اتاترک نے ۱۹۲۳ء میں ترکی کا جمہوری نظام قائم کیا۔اور پہلی بار عوام کے منتخب کردہ نمائندوں پر مشتمل پارلیمانی نظام لایا گیا۔اتاترک کے دور حکومت میں ایک بڑی تبدیلی زبان کی آئی عہد سلطنت عثمانیہ میں عثمانی ترکی زبان بولی جاتی تھی لیکن اتاترک نے ترکی زبان کو قومی زبان قرار دے دیا۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں بنائے گئے محلات کو عجائب گھروں میں تبدیل کر دیا گیا۔دولما باغچے محل ترکی کے مشہور شہر استنبول میں تاریخی شاہی محل ہے۔یہ استنبول کا پہلا یورپی طرز کا محل تھا۔اس کی تعمیر عبدالمجید کے حکم سے ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۳ء میں پانچ ملین عثمانی گولڈ پاؤنڈ کے ساتھ مکمل ہوئی۔ ۱۸۵۳ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک عثمانی سلطنت کا انتظامی مرکز رہا۔اتاترک نے جب حکومت سنبھالی تو اس محل کو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا۔ فرخ سہیل گوئندی سیاحت کی غرض سے جب ترکی پہنچے تب اس محل کو عجائب گھر میں بدل دیا گیا تھا۔

اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> محل کے اندر قدم رکھا تو حیرت اور عبرت کی کشمکش میں دولما باہچے محل کو دیکھ کر ششدر رہ گیا یہاں کبھی عثمانی باغات ہوتے تھے انہی باغیچوں کے مجموعے میں اس محل کی تعمیر کا فیصلہ ہوا۔اسی بنیاد پر اس کو ''باغیچوں کا محل'' قرار دیا گیا۔ باسفورس کنارے شاہی باغیچوں میں اس محل کو دنیا کے خوبصورت اور مہنگے محلات میں شمار کیا جاتا ہے۔ جو ساٹھ سال پہلے تک آباد تھا۔جب اس کے مکینوں سے سلطنت چھن گئی اور یہ محل عجائب گھر میں بدل دیا گیا جو اب جمہوریہ ترکیہ کی قومی اسمبلی کی تحویل میں ہے۔[۲۹]

ترک قوم کی وطن پرستی ترکوں کے مشترکہ تعصب اور تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔وہ اپنے ملک ترکی اور اس کی تاریخ، ثقافت، زبان اور ورثہ کی حفاظت کرتی ہیں اور اسے ترویج دینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ترکوں کی وطن

پرستی گہرے تاریخی روابط، ایک مشترکہ زبان (ترکی)، اور ایک ارضی وسعت پر مبنی ہے۔ ترکوں کی تاریخ میں مختلف امپائرز، امارات، اور ممالک کے قیام و فنا کے باعث، ترک قوم کے لوگوں کی وطن پرستی اور ملی یگانگی کے لئے اہم ہوئی ہے۔ وطن پرستی ترک قوم کی حیثیت، اجتماعی تعلقات اور سیاسی عمل کی بنیاد بناتی ہے۔ یہ ان کی یکسانیت کو قوت بخشتی ہے اور ان کو ملکی تحریکات، سیاسی جماعتوں، اور قومی تنظیموں کو مضبوط کرتی ہے۔ وطن پرستی کی روحانیت اور محوریت وہ قوت ہے جو ترک قوم کو انتہائی جذباتی بناتی ہے اور ان کو ملکی تحقیقات، ترقی، اور تعلیمی میدانوں میں کام کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ترک قوم اپنے وطن اور اس سے جڑی ہر چیز سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ ترکی میں قوم پرستی بہت زیادہ ہے یہ اپنی روایات اور اقدار سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں ترکی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان بولنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ترکی میں اگر وہاں کے باشندوں کے علاوہ بھی کوئی غیر ملکی ترکی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں بات کرے تو بھی ترک قوم برا مناتی ہے۔

ترکوں کے قوم پرستی بیان کرتے ہوئے فرخ صاحب لکھتے ہیں:

> ترک جب کسی سے ملتا ہے تو ترکی زبان یوں بولتا ہے کہ اجنبی بھی ان کی زبان سے اس قدر آشنا ہے۔ کئی ایک تو "قوم پرستی" کا مظاہرہ کرتے ہوئے برا بھی مناتے ہیں کہ تم میرے ساتھ ترکی زبان میں بات کیوں نہیں کر رہے۔ چند مرتبہ تو کچھ ترکوں کے ہاتھ میرے گریبان تک پہنچ گئے کہ تم میرے ساتھ انگریزی بولنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو تم ترکی میں ہو اس لیے ترکی زبان بولو۔ ترکوں کی قوم پرستی میں زبان ایک اہم ترین ستون ہے۔ (۳۰)

تہذیبی اقدار بھی زمانی انسلاک کا باعث بنتی ہیں۔ بعض اوقات سیاسی تغیرات کی وجہ سے تہذیب اور اس کی اقدار پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کسی ملک کے سیاسی تنازعات، انقلابات اور حکومتی نظام میں تبدیلیاں تہذیبی اقدار کو متاثر کرتی ہیں۔ ملکی سطح پر ہونے والی یہ تبدیلیاں معاشرتی رویوں، اخلاقیات، خاندانی نظام اور دیگر معیارات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اقتصادی تغیرات بھی تہذیب کو متاثر کرتے ہیں۔ اقتصادی حالات میں تبدیلی سے لوگوں کے ذرائع آمدن پر فرق پڑتا ہے۔ لوگوں کے روزگار کے مواقع اور معیشتی حالات ملکی سطح پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے تغیرات بھی تبدیلیاں لانے کا سبب بنتے ہیں جیسے اصراف اور خریداری کی عادات بھی معاشرے پر اثرات چھوڑتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال اور نئی اختراعات تہذیبی اقدار کو متاثر کرتی ہیں جو زمانی انسلاک کا سبب بنتی ہیں۔ ہر قوم کا اپنا چال چلن، رہن سہن اور تہذیبی اقدار ہوتی ہیں۔ ہر خطے میں بسنے والے باشندوں کے اپنے نظریات، افکار اور خیالات ہوتے ہیں جن کے مطابق وہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ نظریات، خیالات اور رہن سہن کے طور طریقے انھیں دوسری قوموں سے ممیز کرتے ہیں۔ فرخ سہیل گوئندی نے دوران سفر تینوں ممالک کی الگ الگ تہذیب کو

دیکھا وہ اس بات پر حیران کن نظر آتے ہیں کہ کس طرح صرف ایک سرحد کے بدلنے سے قوموں کے رہن سہن اور طرز زندگی میں فرق آجاتا ہے۔

ایک جگہ چائے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> چائے پینے کا تجربہ ایران میں بھی ہوا تھا، صرف سرحد بدلنے سے چائے کا نیا انداز پایا۔ ایرانی چینی کی ڈلی منہ میں رکھ لیتے ہیں جبکہ ترک سیاہ چائے کے ساتھ دو ڈلیاں فراہم کرتے ہیں۔ چائے چینی کے بغیر ہو یا چینی کے ساتھ، یہ آپ کی مرضی ہے۔ مگر ایک اور بنیادی فرق بھی دیکھا۔ ایرانی چائے کا گلاس ترک چائے کے گلاس سے دو سے تین گنا بڑا ہوتا ہے۔ ترک چائے کا گلاس دو ڈھائی سو ملی لیٹر سے کم نہیں ہوتا۔ عادات، طور اطوار، رسم و رواج قوموں کے مابین ہر قسم کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔ (۳۱)

بلغاریہ کا شمار جنوب مشرقی ممالک میں ہوتا ہے اس کا مشہور شہر صوفیہ ہے جسے باغوں اور پارکوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ بلغاریہ میں جگہ جگہ نصب مجسمے بلغاریہ کی پوری تاریخ کی وضاحت کرتے ہیں۔ ویمتروف نے بلغاریہ میں سوشل ازم کی بنیاد رکھی اس نے ملکی ترقی کے لیے بہت اہم کردار ادا کیا اور سیاست میں بھی اس نے اپنا لوہا منوایا۔ اس کے دور میں ہٹلر اور فسطائیت کی وجہ سے ملکی نظام تباہ ہو رہا تھا، اس نے بہت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہٹلر اور فسطائیت کے خلاف لڑا۔ فرخ سہیل کی بلغاریہ کی سیاحت کے دوران وہاں ہٹلر اور فسطائیت کے خلاف لگے بینرز اور دیمتروف کے لگے مجسمے بلغاریہ کی تاریخ کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔ فرخ سہیل گوئندی اس کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> اشتراکی بلغاریہ میں مختلف مجسموں، میورک قدآور ہورڈنگ بورڈوں، پوسٹرز اور دیگر پروپیگنڈا میٹریل میں جو چیزیں دیکھ رہا تھا، اس میں کارل مارکس اور دیگر اشتراکی رہنماؤں کی تقاریر اور مجسموں کے علاوہ، بلغاریہ کے بانے گیورگی دیمتروف، صدر تودر ژوف کے علاوہ مزدور ، دہقان، خواتین، بچوں کے مجسمے اور تقاریر دیکھنے کو ملیں۔ ان کے علاوہ ایٹمی اسلحہ مخالف، جنگ مخالف اور امن کے حوالے سے پروپیگنڈا نظر آیا۔ اور مختلف جگہوں اور مقامات پر ہٹلر اور نازی ازم کے فاشزم کے حوالے سے بنی تصاویر، پوسٹرز اور ہورڈنگ۔ (۳۲)

بلغاریہ کی مذہبی تشکیل کافی متنوع ہے اور مذہبی تقسیم میں تین اہم جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ بلغاریہ میں مسلمان آبادی کی تعداد تخمیناً ۷-۸ فیصد ہے۔ بلغاریہ کے جنوبی علاقوں میں ترک، یا بلغاریہ کی مسلمان جماعتیں آباد ہیں۔ اسلام بلغاریہ میں رسمی طور پر تسلسل کی عبادت کا حصہ ہے اور مساجد اور مذہبی تعلیمی ادارے عام ہے۔ بلغاریہ کے بڑے حصے میں آرتھوڈوکس عیسائی مسیحیت کے پیروکار پائے جاتے ہیں۔ بلغاری عیسائی علاقوں میں کلیساؤں کی تعداد زیادہ ہے۔ آرتھوڈوکس عیسائی عبادت گاہوں کی خوبصورتی، رسم و رواجات، اور عبادتی تقویم کو پیش کرتی

ہیں۔ بلغاریہ میں کیتھولک عیسائی مسیحیت کے پیروکار بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا مرکز صوفیہ ہے، جہاں پاپ کے ٹیپوس نمایاں ہیں۔ کیتھولک عبادت گاہوں، کلیساؤں، اور عبادتی تقویم کے بھی بلغاریہ کی مذہبی تشکیل کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب مصنف نے وہاں کی سیاحت کی تو انھوں نے جو مشاہدہ کیا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اشتراکی ممالک کے حوالے سے یہ تاثر غلط پایا جاتا ہے کہ وہاں عبادت گاہوں کو مقفل کر دیا گیا ہے مگر مصنف نے بلغاریہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ اشتراکی ملک بلغاریہ جہاں مسلمانوں کی آبادی ۷-۸ فیصد ہے مسلمانوں کو مسجد جاتے دیکھ کر انھیں بڑی حیرانی ہوئی کہ مسجد کھلی ہے اور نمازی وہاں نماز بھی ادا کر رہے ہیں یہ اس تاثر کی نفی کے لیے بتایا گیا ہے جو ہمارے ذہنوں میں اشتراکی ممالک کے حوالے سے دور کیا جا سکے۔

اس مشاہدے کو اپنے سفر نامے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ہمارے ہاں تو کہا جاتا ہے کہ کیمونسٹ ممالک میں تمام عبادت گاہوں پر قفل لگے ہیں۔ کیا سائنا گاگ اور کیا چرچ و مسجد، سب ہی بند ہیں؟ میں حیرت سے اسے تک رہا تھا۔۔۔۔ چند ہی ساعتوں بعد میں نے کیا دیکھا، میرے بائیں جانب ایک قدیم مسجد ہے۔ اس کا سیاہ گنبد اور مینار ایک ہے۔ ایں، یہ کیسے ممکن ہے؟ مسجد اور کیمونسٹ ملک میں؟ پھر سوچا قفل لگے ہوں گے۔ دیکھا تو چند نمازی ٹوپیاں پہنے مسجد سے نماز ادا کر کے باہر نکل رہے تھے۔ میری آنکھیں حیرت سے پلک جھپکنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ کیمونزم اور نماز کی اجازت؟؟؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ مگر وہاں سے نمازی بھی تو نکلتے دیکھے۔۔۔ کیمونزم میں نماز، مسلمان اور اسلام۔۔۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کیوں کہ ہمارے ہاں یقین کروایا گیا تھا کہ کیمونسٹ ممالک کی سب عبادت گاہوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں۔ (۳۳)

اشتراکی ممالک میں لوگ عموماً امن پسندی کی ترجیح دیتے ہیں۔ وہ امن، صفائی اور تناسب کو پسند کرتے ہیں اور اپنے اصولوں پہ قائم رہتے ہیں۔ بلغاریہ میں عمومی امن کو بحال رکھنے کے لیے پولیس اور سیکیورٹی کا انتظام لازمی طور پر کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کی حفاظت کی جا سکے۔ یہاں کاروباری اداروں کی امن و سلامتی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ایمانداری، قانون کا احترام اور صفائی کے اصولوں پر پابندی سے عمل کیا جاتا ہے تاکہ کاروباری معاملات میں فسادات وغیرہ سے بچا جا سکے۔ یہاں عوام اور ان کے حقوق کا خیال کیا جاتا ہے۔ سرکاری اداروں کو اس بات کا پابند بنایا جاتا ہے کہ وہ عوام کی خدمت کے لئے ہمیشہ تیار ہیں اور ان کے مسائل حل کرنے کو کوشش کریں۔

بلغاریہ میں عوام کی امن پسندی، صفائی اور ان کے حقوق کا خاص خیال رکھا جاتا ہے تاکہ سماج میں سلامتی، اطمینان اور امن کی صورت حال برقرار رہ سکے۔ بلغارین قوم کے مزاج کی بات کی جائے تو یہ عموماً دوستانہ اور خوشگوار ہوتا ہے۔ وہ معمولی باتوں پر خوش رہنے والے لوگ ہیں جو اپنی زندگی کو سادگی کے ساتھ گزارنے کے خواہشمند

ہیں۔ مجموعی طور پر، بلغارین لوگ دوسروں کے ساتھ مسرت بخش اور دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں اور ان کا مزاج پر مسرت اور ہمدردی کا احساس ہوتا ہے۔

بلغارین قوم کے مزاج کے بارے میں لکھتے ہیں:

> خاموشی، سکون، شفاف فضا اور اطمینان سے چلتے شہری میں پہلی بار دیکھے تھے۔ میرے بائیں ہاتھ ایک عمارت تھی اور اس کے سامنے میرے دائیں جانب ایتھنز کے ایکرو پولس ٹیمپل جیسی عمارت جس کے دروازے پر ادب سے اکڑے اشتراکی پہرے دار کھڑے تھے اور عمارت کے ساتھ لاتعداد گلدستے رکھے تھے، حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں، غیر ملکی سفارت کاروں اور غیر ملکی اعلیٰ وفود کی طرف سے اور عام شہریوں کی طرف سے رکھے گئے گلدستے بھی۔ لوگوں کی ایک قطار تھی۔ سنا تھا کہ یورپ میں فیملی کا کوئی تصور ہی نہیں، جبکہ قطار میں زیادہ تر لوگ اپنی فیملی کے ساتھ کھڑے تھے، ماں، باپ، بیٹے، بیٹیاں۔ سب باادب اس عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔(۳۴)

بلغاریہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۹۰ء تک سوشلسٹ جمہوریہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی حکومت بلغاریہ کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اثر تھی۔ اس کا سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظام کو سوشلسٹ اصولوں پر مد نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا۔ جب بلغاریہ میں سوشلزم قائم کیا گیا تو کیپیٹل ازم کو ختم کر دیا گیا اور ریاست کو عوامی بنایا گیا۔ یہاں اقتصادی نظام جیسے تجارت، صنعت اور زمینی ملکیت اشتراکی نظام کے تحت منظم کیا گیا۔ سوشلسٹ نظام کے دوران عوام کو سیاست اور آئین کا پابند بنایا گیا، اور عدم اطمینان کی کیفیت سے بچنے کے لیے ملک میں جاسوسی نظام کا ستعال کیا گیا۔ اس دوران انتخابات پر پابندیاں لگادی گئیں۔ بلغاریہ میں سوشلسٹ نظام کے دوران سماجی نظام میں بھی بہت سی تبدیلیاں آئیں، اس میں تعلیم کو عوامی بنانے کی کوشش کی گئی اور اس قانون کی تشکیل کے لیے اصول مقرر کیے گئے۔ مسلمانوں اور اقلیت پر مبنی عقائد پر پابندی عائد کی گئی اور مذہبی حوالے سے بھی پابند کیا گیا۔

بلغاریہ کا اشتراکی نظام اس کی تشکیل (۱۹۴۶ء تا ۱۹۹۹) کے دوران سے مضبوط رہا۔ یہ ملک سوشلسٹ جمہوریہ کے تحت اشتراکی نظام قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد معاشی انصاف، تسلط سے نجات، اور سماجی ترقی تھی۔ اس کا اشتراکی نظام عدالتی اصولوں، مالی نظاموں، تجارتی قوانین، صنعتی کارکردگی کے قواعد اور زراعتی نظام پر مبنی تھا۔ اشتراکی نظام میں زمینی ملکیت کو عمومی بنایا گیا، اور سرکاری مال و دولت کی تقسیم کو عدالتی تقسیم سے تنظیم دیا گیا۔ یہاں کا اشتراکی نظام سماجی بنیادوں پر مبنی تعلیم، صحت، مسکن، روزگار، روزگار کی حفاظت اور دیگر سماجی خدمات پر توجہ دیتا تھا۔ اس نظام میں عوامی خدمات کی فراہمی کو ترقی دی گئی اور عوامی سرکاری اداروں کا تشکیل دیا گیا جو عوامی خدمات کی فراہمی اور مردم کی فلاح کی ذمہ داری رکھتے تھے۔ بلغاریہ کا اشتراکی نظام سیاسی، اقتصادی اور سماجی تناظرات پر مبنی تھا جو ملک کی سیاست،

معیشت اور معاشرتی طرز زندگی پر اثر انداز ہوتا تھا۔ اشتراکی نظام کے تحت بلغاریہ میں عوامی سماجیت، مساوات، عدل، سماجی امن، تعلیم، صحت، اقتصادی امن، وظائف کی حفاظت اور سماجی ترقی کو ترویج دیا گیا تھا۔ جب ملک میں اشتراکی نظام قائم کیا گیا تو ملکی نظام میں تبدیلیاں کی گئیں اور سیاحت کو فروغ دیا گیا۔ سیاحتی حوالے سے کئی تبدیلیاں کی گئیں یہ تبدیلیاں ملک ترقی کو ملحوظ خاطر رکھ کر دی گئیں۔

اس کی ایک مثال گوئندی صاحب یوں پیش کرتے ہیں:

> بلغاریہ کا بحیرہ اسود کے کنارے پر آباد تین ہزار سال پرانا یہ شہر اس لیے بھی حسین ترین ہے کہ یہ سرِ ساحل واقع ہے جس کے شہر پر گہرے تاریخی اثرات ہیں۔۔۔۔اشتراکی انقلاب کے بعد ،اشتراکی تعمیر وصنعت نے اسے نئی شناخت بھی دی۔ دولاکھ سے کچھ زاہد آبادی پر مشتمل برگاس بلغاریہ کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ کیمونسٹ انقلاب کے بعد اس کے سمندری ساحلوں پر سیاحوں کے لیے موسم گرما کے لیے بستیاں بنا کر اسے سیاحوں کا شہر بنا دیا، ساٹھ کی دہائی میں یہاں کیمونسٹ حکومت نے ہزاروں کمروں پر مشتمل ایک سو سے زائد ہوٹل قائم کیے اور ان ہوٹلوں کے ساتھ دیگر سیاحتی تفریح کے لاتعداد انتظامات۔ (۳۵)

۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک بلغاریہ ایک اشتراکی مملکت کی صورت میں ابھرا۔ اشتراکی ملک میں ملکی تشکیل مشترکہ ملکیت پر مبنی ہوتی ہے، جہاں ملکیت عموماً عوام سے تعلق رکھتی ہے۔ ملکیت میں عام طور پر زمین، زرعی زمین اور عمارتیں وغیرہ کو شامل ہوتی ہیں۔ اشتراکی ملک میں مال کی تقسیم عادلانہ ہوتی ہے۔ عوام کے درمیان مال کی تقسیم منصوبہ بندی کے ذریعے کی جاتی ہے تاکہ عدل قائم رہ سکے اور ملکی سرمایہ عوام کی فلاح پر خرچ ہو اور عادلانہ تقسیم ہو سکے۔ سوشلسٹ ملک میں عدالتی نظام، عدالتی انصاف اور سماجی عدالت کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ عوام کے حقوق کا احترام کیا جاتا ہے اور عدالتی راستوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اشتراکی ملک میں عوام کے منتخب شدہ نمائندے کو عوامی طور پر حکومت کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ حکومتی تشکیل میں عام طور پر جمہوریت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اور عوامی انتخابات کے ذریعے نمائندگان کو منتخب کیا جاتا ہے۔ اشتراکی ملک میں اقتصادی نظام تنظیم پر مبنی ہوتا ہے، جہاں عوامی مفاد کی حفاظت کی جاتی ہے اور سماجی تناسب کو مد نظر رکھتے ہوئے اقتصادی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ اشتراکی ملک میں سماجی امن وامان، تعلیم، صحت، اور معاشرتی سہولیات کو عوام کیلئے فراہم کیا جاتا ہے۔ ان ممالک میں عوام کو حکومتی فیصلوں میں شرکت کی اجازت ہوتی ہے. عوامی اجلاسوں اور جمعیتوں کو عوامی پالیسیوں کی تشکیل میں شریک کیا جاتا ہے۔ اس ملک کو جب اشتراکی قرار دیا گیا تو اس کے نظام میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس نے بے پناہ

ترقی کی۔ یہ ترقی خواہ تعلیمی میدان میں ہو یا زرعی، سیاسی ہو یا سماجی غرض ہر شعبے میں بلغاریہ نے ترقی کی۔ عبداللہ ملک اپنی کتاب صوفیہ سے چند خطوط میں صنعتی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ۱۹۴۴ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد بلغاریہ کی مصلحت اندیشی کا رجحان صنعتی ترقی پر مرکوز ہے۔ قومی معیشت کے تمام میدانوں میں صنعتی ترقی کو اہمیت بلغاریہ کے لوگوں کی ثقافتی اور صنعت و حرفت کی سطح کو بلند کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ چھوٹی صنعتوں پر بھی کم توجہ نہیں دی گئی۔ پچھلے ۳۳سال میں روزمرہ کی استعمال کی اشیا کی پیداوار میں مجموعی طور پر ۲۰ گناہ اضافہ ہوا دوسری صنعتوں میں یہ اضافہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہوا ہے۔ صنعتیں نئے اور جدید طریقوں سے چلائی جا رہی ہیں۔۔۔۔ صنعت کے ساتھ ساتھ بلغاریہ میں زرعی میدان میں بھی حقیقی معنوں میں ترقی کی ہے بلاشبہ جو نتائج حاصل ہوئے نہ صرف وہ ماضی سے بہتر ہیں بلکہ اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ (۳۶)

بلغاریہ میں اشتراکیت کے بعد، اقتصادی نظام کو تبدیل کر دیا گیا۔ خصوصی ملکیت کو تقسیم کر دیا گیا اور آمدن کے ذرائع کو بڑھایا گیا اور صنعتی ، زرعی اور بینکاری نظام میں دولت کی تقسیم منصفانہ کی گئی۔ بلغاریہ میں اشتراکیت کے بعد، زمین کی تقسیم کی گئی۔ زمینی قوانین کے ذریعے چھوٹے کسانوں کو زمینوں میں برابر حصہ دیا گیا۔ اشتراکیت کے بعد، بلغاریہ میں تعلیم و تربیت کا نظام تبدیل کر دیا گیا۔ تعلیم کو سب کے لیے لازمی قرار دیا اور مفت تعلیم کی سہولیات فراہم کی گئیں۔ بلغاریہ میں اشتراکی اصولوں پر مبنی سماجی نظام قائم کیا گیا۔ عوام کو زندگی کی بنیادی ضروریات، صحت، مسکن، روزگار، اور دیگر سماجی سہولیات فراہم کی گئیں۔۔ اشتراکیت کے دوران، بلغاریہ میں سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، اور ثقافتی تبدیلیاں واقع ہوئیں جو ملک کی تاریخ پر اثر انداز ہوئیں۔ اقتصادی حوالے بہت سی تبدیلیاں کی گئیں اور زرعی کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی پر بہت زور دیا گیا۔

> دیمتروف کو سراسر ایک صنعتی شہر پایا، سڑک پر چلنے والی ٹریفک بھی اس کے صنعتی ہونے کی عکاس تھی۔ صوفیہ کے مضافات جہاں ختم ہو جاتے ہیں، وہیں یہ شہر شروع ہو جاتا ہے۔ اس شہر نے اشتراکیت کے بعد بہت اہم صنعتی اہمیت حاصل کر لی ستروما کے کنارے آباد اس صنعتی شہر میں آلودگی نام کی کوئی شے نہ تھی۔ دیمتروف بلغاریہ میں سٹیل مل سے لے کر ہیوی انڈسٹریز اور کان کنی کے حوالے سے اقتصادی کردار ادا کرنے والا شہر ہے۔ (۳۷)

دیمتروف گراڈ بلغاریہ میں واقع ایک شہر ہے ۱۹۸۳ء میں اس کی آبادی پچاس ہزار سے اوپر تھی اس شہر کو گیورگی دیمتروف کے نام پر بسایا گیا۔ گیورگی دیمتروف (Georgi Dimitrov) بلغاریہ کے مشہور سیاسی شخصیت تھے۔ وہ بلغاریہ کمیونسٹ پارٹی کے اہم رہنما تھے اور اشتراکیت کے ایک مشہور نمائندہ بنے۔ دیمتروف نے

مسلم لیڈر کے طور پر مختلف تنظیموں میں کام کیا اور بلغاریہ کے اقتصادی اور سیاسی معاملات پر قابو پانے کیلئے جد وجہد کی۔ ان کو کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل و تعمیر میں کردار ادا کرنے پر شہرت حاصل ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں بلغاریہ میں اشتراکیت کی حکومت قائم ہوئی اور گیورگی دیمتروف وزیر اعلیٰ بنے۔ ان کی حکومت میں بلغاریہ میں اقتصادی اصلاحات کی گئیں، عوامی خدمات کو فروغ دیا گیا اور بلغاریہ کو اشتراکی نظام کی طرف لایا گیا۔ گیورگی دیمتروف نے ۱۹۴۴ سے لے کر ۱۹۴۹ء بلغاریہ میں اشتراکی نظام قائم کیا جب وہ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکرٹری بنے۔ گیورگی دیمتروف کو جولائی، ۱۹۴۹ء میں بلغاریہ کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ بعد ازاں انھوں نے بلغاریہ میں اصلاحات کے لیے بہت سے اہم اقدامات کیے۔ اس لیے ان کو اشتراکی بلغاریہ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دیمتروف کے نام پر جب بستی بسانے کا اعلان کیا گیا تو پورے ملک کے لوگوں نے اس کو بسانے میں اپنا حصہ ڈالا اور تین سال کے مختصر ترین عرصے میں اس شہر کو بسانے میں کامیاب ہو گئے۔

فرخ سہیل اس شہر کی تصویر یوں پیش کرتے ہیں:

> دیمتروف گراڈ کی عمارتیں، درخت، فٹ پاتھ، گلیوں کی ترتیب، پارک اور وہاں چلتے لوگ ... واقعی سرخ جنت کا سماں ہزاروں میل دور سے آیا مسافر ایک ایسی غیر معروف بستی کے دل میں کھڑا تھا جس کے نام سے آہنی دیوار کے پار کوئی آشنا نہیں تھا۔ میں اشتراکی بستی کے دل میں کھڑا تھا۔ چودہ منزلوں پر مشتمل دیمتروف سٹی ہال، جس کی پیشانی پر بلغارین زبان میں نمایاں طور پر لکھا تھا، "کمیونسٹ پارٹی بلغاریہ کی نویں کانگریس"۔ دیمتروف گراڈ کے سٹی حال کے ساتھ ہی گیورگی دیمتروف کا سوٹ پہنے تنا کھڑا مجسمہ نصب تھا۔۔۔۔ دیمتروف گراڈ کا شہر سارے بلغاریہ کا عکاس تھا۔ اس کا ماحول، تعمیرات اور مجسمے۔ (۳۸)

انیسویں صدی کے آغاز میں بلغاریہ میں ترقی پسند نظریات مثلاً لبرل ازم اور قوم پرستی وغیرہ پروان چڑھے، یہ نظریات یونان سے ہو کر فرانسیسی انقلاب کے بعد پہنچے۔ عثمانیوں کے خلاف یونانیوں کی بغاوت ۱۸۲۱ء میں شروع ہوئی جس نے بلغاریہ کے پڑھے لکھے طبقے کو بھی متاثر کیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں دیمتروف نے اپنے وطن کے لیے آواز بلند کی لیکن اسے دبا دیا گیا۔ ۱۸۷۶ء میں بلغاریہ میں انقلابی کمیٹی کی طرف سے ایک تحریک اٹھی جس پر خاص ردعمل سامنے آیا اور اس میں عثمانیوں کا ردعمل سب سے زیادہ تھا۔ اس ردعمل کی وجہ سے تیس ہزار افراد کا قتل عام کیا گیا۔ بلغاریہ میں پہلے جمہوری آئین کا اعلان ۱۸۷۹ء میں کیا گیا، ۱۹۰۸ء میں بلغاریہ نے باضابطہ آزادی حاصل کی۔ پہلی جنگ عظیم میں بلغاریہ، سربیا اور یونان کا اتحاد تھا اور انھوں نے بلغاریہ پر حملہ کر دیا تا کہ مقدونیہ کو حاصل کر سکے۔ مقدونیہ کی ترکی سے علاحدگی کے تنازعہ کی وجہ سے ۱۹۱۳ء میں دوسری بلقان جنگ لڑی گئی۔ اس نے فروری

۱۹۴۱ء کو امن معاہدہ پر دستخط کیے۔ جب ۲۸ فروری ۱۹۴۱ء میں جرمن فوج نے رومانیہ اور بلغاریہ کی سرحد پار کی تو سوویت یونین نے اس حملے کی شدید مذمت کی۔ سوویت یونین نے ۱۹۴۴ء میں بلغاریہ کے خلاف اعلان جنگ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ گیورگی دیمتروف نے کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے ان کی سربراہی میں کیمونسٹوں کو اقتدار مل گیا اور ۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء میں عوامی جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔ ۱۹۹۴ تک ملک میں سوشلسٹ نظام قائم رہا اور آخر میں جمہوری نظام قائم کر دیا گیا۔ فرخ سہیل گوئندی کے دوران سفر بلغارین باشندے ایوالو سے ملاقات ہوئی۔ وہ کافی بڑی عمر کے تھے ان کی پیدائش ۱۸۹۹ء کی تھی وہ بلغاریہ کے سارے حالات و واقعات کے عینی شاہد تھے۔

بلغاریہ کے تاریخی واقعات جن کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> ستمبر ۱۹۴۴ء میں جب سوویت یونین کی سرخ فوج اس شہر اور ملک کو ہٹلر کے فاشسٹوں سے نجات دلانے کے لیے آئی، میں اس جنگ مین خاموش تماشائی نہیں تھا بلکہ سرخ فوج کے شانہ بشانہ نازیوں کے خلاف لڑا۔ اس وقت بلغاریہ کا بادشاہ، نازیوں کا اتحادی تھا۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں بلغاریہ کے کیمونسٹوں نے مقبول عوامی تحریک کے نتیجے میں بلغاریہ کے بادشاہ کا تختہ الٹا۔ اس وقت میں بھرپور جوان تھا۔ میں نے سارا منظر اس شہر کی گلیوں میں دیکھا ہی نہیں بلکہ اس عمل کا حصہ تھا، آزادی اور انقلاب کا حصہ۔ (۳۹)

سفرنامے میں ہوں جہاں گرد میں زمانی انسلاک کے حوالے سے کافی مواد موجود ہے۔ مصنف نے اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حوالوں کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے اس عہد کی مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ وہ سیاسی عناصر جنھوں نے ان ملکوں کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا اس کا تذکرہ موجود ہے۔ ان سیاسی عناصر کے تحت وقوع پذیر ہونے والے واقعات نے معاشرتی زندگی کو کس طرح متاثر کیا اس پر بھی مصنف نے قلم اٹھایا۔ سماجی شکست وریخت، رویوں، رہن سہن اور قومی مزاج میں تبدیلی پر سیاسی واقعات (جو تاریخی لحاظ سے اہم موثر ثابت ہوئے) کا اثر بڑے پر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثر انداز ہونے والے عالمی یا ملکی سطح پر واقعات کا تذکرہ بھی موجود ہے مثلاً دوسری جنگ عظیم نے ایرانی، ترک اور بلغاری معاشرے، سماج اور سیاست کو کیسے متاثر کیا۔ ان قوموں نے ان واقعات پر جو ردعمل اپنایا اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹر الطاف انجم،اردو میں ما بعد جدید تنقید(لاہور:عکس پبلشرز،۲۰۱۸ء)،ص ۱۴۲۔

۲۔فرخ سہیل گو ئندی،میں ہوں جہاں گرد(لاہور:جمہوری پبلی کیشنز،۲۰۲۱)،ص ۱۴۔

۳۔ایضاً،ص ۳۸،۳۶۔

۴۔ایضاً،ص ۴۰۔

۵۔ایضاً،ص ۳۷۔

۶۔یوسف عرفان،''جنرل ضیاء الحق اور مریکہ''مشمولہ روزنامہ دنیا،۱۸اگست ۲۰۲۲ء۔

۷۔فرخ سہیل گو ئندی،میں ہوں جہاں گرد(لاہور:جمہوری پبلی کیشنز،۲۰۲۱)،ص ۳۸۔

۸۔ایضاً،ص ۷۰۔

۹۔ایضاً،ص ۵۴۔

۱۰۔ایضاً،ص ۵۷۔

۱۱۔ایضاً،ص ۱۰۵۔

۱۲۔سبط حسن،انقلاب ایران(فیض آباد:نور اسلام،۱۳۹۹ھ)،ص ۱۵۹۔

۱۳۔فرخ سہیل گو ئندی،میں ہوں جہاں گرد(لاہور:جمہوری پبلی کیشنز،۲۰۲۱)،ص ۷۱۔

۱۴۔ایضاً،ص ۱۰۷۔

۱۵۔ایضاً،ص ۱۱۲۔

۱۶۔ایضاً،ص ۲۷۴۔

۱۷۔ایضاً،ص ۹۲۔

۱۸۔ایضاً،ص ۹۴۔

۱۹۔http://urdualarabiya.nd/politics/2015/7/4

۲۰۔فرخ سہیل گو ئندی،میں ہوں جہاں گرد(لاہور:جمہوری پبلی کیشنز،۲۰۲۱)،ص ۱۴۳۔

۲۱۔ایضاً، ص ۱۷۴۔

۲۲۔ایضاً، ص ۳۹۱۔

۲۳۔ایضاً، ص ۲۰۶۔

۲۴۔ایضاً، ص ۱۷۱۔

۲۵۔ایضاً، ص ۱۶۱۔

۲۶۔ایضاً، ص ۱۵۷۔

۲۷۔ایضاً، ص ۱۰۴۔

۲۸۔ایضاً، ص ۲۹۰۔

۲۹۔ایضاً، ص ۴۶۹۔

۳۰۔ایضاً، ص ۱۷۰۔

۳۱۔ایضاً، ص ۱۴۴۔

۳۲۔ایضاً، ص ۶۳۳۔

۳۳۔ایضاً، ص ۵۶۲۔

۳۴۔ایضاً، ص ۵۶۶۔

۳۵۔ایضاً، ص ۶۸۳۔

۳۶۔عبداللہ ملک، صوفیہ سے چند خطوط (لاہور: کوثر پبلشرز، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۴۸۔

۳۷۔فرخ سہیل گوئندی، میں ہوں جہاں گرد، ایضاً، ص ۲۲۷۔

۳۸۔ایضاً، ص ۶۷۴۔

۳۹۔ایضاً، ص ۵۹۱۔

باب سوم:

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تہذیبی اقدار کی پیش کش

تہذیب کے معنی عام طور پر شائستگی ،نرمی اور اصلاح کے لیے جاتے ہیں۔مختلف لغات میں اس کے معنی درخت کی کانٹ چھانٹ اور تراش خراش کے بیان ہوئے ہیں۔سبط حسن تہذیب کے معنی عربی اردو اور فارسی میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں کسی درخت یا پودے کو کاٹنا، چھانٹنا اور تراشنا تاکہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھوٹیں۔فارسی میں تہذیب کے معنی "آراستن و پیراستن، پاک و درست کردن و اصلاح نمودن" اردو میں تہذیب کا لفظ عام طور پر شائستگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔(۱)

تہذیب کا لفظ عربی زبان سے اخذ کیا گیا ہے۔فرہنگ آصفیہ میں اس معنی ا۔آراستگی،صفائی،پاکی،درستی ،اصلاح،۔۲۔شائستگی،خوش اخلاقی،ہیئت،لیاقت،آدمیت،تربیت،انسانیت،شرافت کے درج ہیں۔(۲) تہذیب کے عام طور پر معنی پاک کرنا،اصلاح کرنا،شائستگی،انسانیت،معاشرے کے رسم و رواج،اس کے اصول اور اقدار وغیرہ لیے جاتے ہیں۔ہر قوم کے اپنے نظریات،عقائد،اخلاقیات،اقدار،رسوم و رواج،رجحانات،آداب واطوار،رہن سہن، طرز زندگی اور بود و باش ہوتا ہے یہ سب تہذیب کے زمرے میں آتے ہیں۔ان ہی خصوصیات کی بدولت ایک قوم دوسری قوموں سے ممتاز ہوتی ہے۔

تہذیب کی تعریف سبط حسن اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقا میں یوں کرتے ہیں:

> کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔چنانچہ زبان ،آلات و اوزار ،پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے،رہن سہن،فنون لطیفہ ،علم و ادب،فلسفہ و حکمت،عقائد و

افسوں، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔ (۳)

ہر قوم کا اپنا تہذیبی تشخص ہوتا ہے جو اسے دوسری قوموں سے ممیّز کرتا ہے۔ قوموں میں پائے جانے والے بعض تہذیبی پہلو دوسری قوموں سے ملتے ہوتے ہیں اور بعض بالکل ہی مختلف ہوتے ہیں ا۔ یہی انفرادی پہلو ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ تہذیبی شناخت دیتے ہیں اور قومیں انہی الگ خصوصیات کی بنا پر پہچانی جاتی ہیں۔ ہر قوم کے اپنے عقائد، رہن سہن، اقدارر، سومات اور نظریات ہوتے ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ کانٹ چھانٹ اور اصلاح ہوتی رہتی ہے اور اپنی ضرورتوں اور وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ قوموں کے مزاج اور طور اطوار میں بھی فرق آتا ہے جو اسے الگ تہذیبی تشخص دیتی ہیں۔ تہذیب اپنے اندر وسعت اور معنویت رکھتی ہے اور انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔

سید عابد حسین لکھتے ہیں:

اس (تہذیب) کے سب سے زیادہ مشہور معنی پاکیزہ و پسندیدہ اخلاق و آداب جس میں شخص کی طبعیت، چال ڈھال، گفتگو اور برتاؤ میں ایک خاص موزونیت اور دلکشی ہو مہذب کہلاتا ہے ان مادی چیزوں پر بھی تہذیب کا اطلاق ہوتا ہے جو انسان کے حسن ذوق اور انسان کے حسن عمل سے وجود میں آئی ہیں۔ مثلاً ہم مغلوں کی عہد کی عمارتوں، باغوں اور تصویروں کو مغلیہ تہذیب کے آثار کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی قوم کی اجتماعی ادارت اور اصول و قوانین بھی تہذیب کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں جیسے قدیم یونانیوں کا نظام ریاست اور نظام تعلیم یا قدیم رومیوں کا نظام قانون ان قوموں کی تہذیب کے عناصر سمجھے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تہذیب کا لفظ اس سے زیادہ مجرد اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے یعنی زندگی کا مکمل نصب العین جو کسی قوم کے سامنے ہو ان معیاروں کا ہم آہنگ تصور جن پر وہ اپنی اور دوسروں کی زندگی پرکھتی ہے۔ (۴)

اس سے تہذیب کا جو زاویہ ابھرتا ہے وہ یہ کہ تہذیب زندگی کا مکمل نصب العین ہے جس کے تحت ہمارے عقائد، ہمارا رہن سہن، خیالات اور نظریات پروان چڑھتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تہذیب صرف انسان کے خیالات اور سوچ کا احاطہ کرتی ہے بلکہ اس میں رہن سہن، طور اطوار، ملبوسات، زیورات، رسومات، اوزار، عمارتیں، اقتصادی نظام، زبان و ادب اور معاشرتی ادارے سب شامل ہیں۔

جب قومیں دوسرے ممالک پر قابض ہوتی ہیں یا ان کو فتح کرتی ہیں تو ان علاقوں کے تہذیبی اثرات میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں مثلاً زبان پر اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور محکوم قومیں نئی زبان کے اثرات قبول کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی ادارے، اقتصادی نظام اور فنون لطیفہ پر اثرات واضح ہوتے ہیں۔ عام طور پر تہذیب کے تین پہلو بیان

کیے جاتے ہیں۔سب سے پہلے جس کا ذکر کیا جاتا ہے اس میں کسی قوم کے عقائد،اقدار،نظام فکر اور نظریات کو بیان کیا جاتا ہے۔دوسرا پہلو اس قوم کے رہن سہن کے طریقے ہیں جس میں اس قوم کی روایات،اخلاق و آداب،عادات وغیرہ شامل ہیں ان پر بحث کی جاتی ہے اور تیسرا اس کے فنون ہیں۔یہ تینوں پہلو ایک مثلث کی طرح ایک دوسرے سے باہم جڑے ہوئے ہیں جنھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ایک فرد جو ایک معاشرے کا حصہ ہوتا ہے وہ ان پہلوؤں سے متاثر ہوتا ہے،یہی پہلو اس کی زندگی کا جزو بن جاتے ہیں۔وہ افراد جو کسی دوسرے خطے سے یہاں آکر آباد ہوتے ہیں ان پر اس معاشرے کی روایات،اقدار،نظام فکر اور طرزِ زندگی وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے اور یہی پہلو اس کی سوچ اور رویے میں تغیر کا سبب بنتی ہے۔

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد تین ممالک (ایران،ترکی اور بلغاریہ) کے سفر پر مشتمل ہے جس میں فرخ سہیل گوئندی نے تینوں ممالک کے سفر کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تہذیب کو بھی تفصیلی بیان کیا ہے۔فرخ سہیل نے ان ممالک کے سفر کے لیے زمینی راستہ اختیار کیا اور انھوں نے لاہور سے ایران اور وہاں سے ترکی پھر ترکی سے بلغاریہ کا سفر کیا۔اس دوران جو واقعات پیش آئے اُنھوں نے ان کو ضبط تحریر میں لانے کے ساتھ ساتھ وہاں کے نظام فکر،عوام کی سوچ،رہن سہن،خوراک،لباس اور فنون وغیرہ سے بھی آگاہ کیا۔ان تینوں ممالک کی تہذیبی اقدار سے فرخ سہیل نے کس طرح آگاہ کیا؟اس کو ترتیب وار بیان کیا جائے گا۔

فرخ سہیل گوئندی نے سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تہذیبی اقدار کی پیش کش عمدہ طریقے سے کی ہے۔ان کا مشاہدہ نہایت وسیع ہے اور وہ خود بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ایک سیاح کے لیے کھلی آنکھ سے مشاہدہ کرنا کئی کتب کے پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے۔لہٰذا ان کے مشاہدے میں گہرائی اور گیرائی کا عنصر نمایاں ہے۔ اُنھوں نے ایران کی زبان،ثقافت،رہن سہن،عقائد،نظریات،فکر،رسم و رواج اور خوراک وغیرہ کو جس انداز میں دیکھا اور محسوس کیا اسی طرح پیش کر دیا۔

تہذیب میں نظریاتی عوامل کو اہم گردانا جاتا ہے۔نظریاتی عوامل میں انسان کا مکمل نظام فکر،زندگی اور کائنات کے بارے میں اس کے خیالات،اس کے عقائد،نظریات اور حیات و موت کے حوالے سے اعتقادات وغیرہ شامل ہیں۔نظریات،خیالات،عقائد اور افکار معاشرے کی بناوٹ پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔نظریات،خیالات اور عقائد معاشرے کی ثقافتی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔یہ کسی معاشرے کی اقدار،اخلاقیات،روایات،عبادات اور روزمرہ کی زندگی پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔نظریات اور عقائد کے مطابق معاشرتی روایات تشکیل پاتی ہیں۔ان روایات کی بناوٹ معاشرے کے اصول،قوانین،اخلاقی معیار اور اصول بنتے ہیں۔یہ عوامل سیاسی نظام پر بھی اپنا اثر چھوڑتے

ہیں۔سیاسی نظام میں عدل،امن، حقوق انسان، سیاسی حریتیں،انصاف، حکومتی پلان،وغیرہ کی بناوٹ میں نظریاتی افکار اپنا گہرا اثر مرتب کرتے ہیں۔ نظریات، خیالات اور عقائد اقتصادیات کو بھی متاثر کرتے ہیں۔معاشی نظام، سرمایہ داری، تقسیمِ وسائل،روزگار، سرمایہ کاری، سود وغیرہ پر نظریاتی افکار کی چھاپ ہوتی ہے۔عدالتی نظام،روابطِ اجتماعی، خاندانی نظام، تعلیمی نظام، مذہبی تعلقات، تجارتی روابط کا جائزہ لیا جائے تو ان پر بھی نظریات اور عقائد کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ نظریاتی افکار فن وثقافت کی بناوٹ پر بھی اپنا گہرا اثر مرتب کرتے ہیں۔ادب، فلم،موسیقی، نغمے،رقص، تصویر، فلسفہ وغیرہ میں نظریاتی افکار اور عقائد کی جھلک نظر آتی ہے۔

ایران میں مختلف عقائد و مذاہب پائے جاتے ہیں، لیکن زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے، یہ مسلمان زیادہ تر شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔شیعہ مسلک ایران کا عام مذہبی نظام ہے اور ایرانیوں کے عقائد میں اس کا بہت اہم کردار ہے۔مذہبی عقیدوں کے علاوہ، ایرانی معاشرے میں مختلف فکری روایات اور سیاسی عقائد بھی پائے جاتے ہیں اگرچہ ایران میں مذہبی عقائد اور سیاسی فکری روایات کے درمیان مختلف تنازعات بھی پائے جاتے ہیں، لیکن یہاں کے لوگ عام طور پر اپنی عقیدوں اور اعتقادات کو احترام دیتے ہیں اور ان کی حفاظت کا مطالبہ کرتے ہیں۔فرخ سہیل صاحب نے جب ایران کا سفر کیا تب وہاں انقلاب برپا تھا اور اس کا زیادہ اثر اور انقلاب کا نشانہ زیادہ تر درسگاہوں وغیرہ کو بنایا گیا۔

ان کا ذکر کرتے ہوئے فرخ سہیل کہتے ہیں:

> دانش گاہِ تہران، رضا شاہ پہلوی کے خلاف تہران میں انقلاب کا سب سے بڑا مورچہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ اسکے ساتھ والا چوک میدانِ انقلاب ٹھہرا۔۔۔۔امام خمینی نے انقلاب کے بعد ایران کی ریاست کو اسلامیانے کا جو عمل شروع کیا،اس میں تعلیمی ادارے سرِ فہرست تھے۔۔۔۔چونکہ راہبر انقلاب کی نظر میں سیاست اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے اس اسلامیانے کے عمل میں دانش گاہ تہران سب سے زیادی اسلامائزیشن کا نشانہ بنی اور یہ یونیورسٹی درحقیقت ترقی پسندوں، کیمونسٹوں اور روشن خیال قوم پرستوں کا گڑھ تھی اور یہی لوگ انقلاب کا پہلا قطرہ بنے۔[۵]

انقلاب ایران ۱۹۷۹ء سے قبل اور بعد میں وہاں کی قوم کے نظریات میں کئی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں اور انقلاب ایران نے لوگوں کے نظریات کو متاثر کیا۔ قبل از انقلاب، ایران میں شاہی سلطنت قائم تھی اور ملک کی حکومت ایک بادشاہ کے زیرِ انتظام چل رہی تھی۔ ان کا نظریاتی رویہ انقلابی نظریات سے مختلف تھا عوام شاہ کے نظریات کو مانتی تھی۔ایران میں مختلف مذہبی فرقوں کے لوگ رہتے تھے، جن کے نظریات میں اختلافات تھے۔شیعہ مسلمانوں کی بڑی تعداد تھی، لیکن سنی، مسیحی، یہودی اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی موجود تھے۔ہر مذہبی فرقے کے

نظریات اور عقائد میں تفاوتیں تھیں۔ انقلاب ایران نے موجودہ شاہی سلطنت کو ختم کر کے اسلامی جمہوریہ قائم کی۔ لوگوں کے نظریات میں اسلامی نظام کو پہلے سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اور وہ اسلامی نظام کو قبول کرنے کی جانب رجوع کرنے لگے۔ انقلاب کے بعد مغربی روایات واقدار کو اپنانے پر پابندی لگادی گئی۔ لوگوں کے مغربی نظریات اور مغربی ترقی کا رد عمل کے طور پر قبول کیا۔ انقلاب کے بعد، ایران میں اجتماعی تبدیلیاں بھی دیکھی گئیں خصوصاً عورتوں کے حقوق کے حوالے سے نئے قوانین بنائے گئے۔ لوگوں کے نظریات میں عدل وانصاف کے لئے جدید سوچ اور تبدیلیاں دیکھی گئیں۔ انقلاب ایران نے لوگوں کے نظریات کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہ ایک اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش تھی جس نے عوام کے نظریات، خیالات، عقیدے اور افکار پر عمیق اثر ڈالے۔ عوام کو اپنے نظریات پر زیادہ غور کرنے اور اسلامی نظام کی تشکیل میں حصہ لینے کی ترغیب دی گئی۔ انقلاب نے عام لوگوں کو سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی حوالے سے بیدار کیا۔ اس سے قبل ایران میں کیمونسٹ نظام تھا جو ایران کے شاہی محل کے لیے خوف کا باعث تھا۔

جس کی وضاحت فرخ سہیل نے یوں کی ہے:

> ایران کے شاہی محلات میں یہ خوف شروع دن ہی سے پھیلا ہوا تھا کہ تخت شاہی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ایران کے کیمونسٹ ہیں جو کہ غلط بھی نہیں تھا۔۔۔۔ انقلاب ایران میں ہر اول دستے کا کردار یہی کیمونسٹ، سوشلسٹ اور ترقی پسند لوگ کر رہے تھے۔[۷]

کسی خطے میں بسنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟ ان کا طرزِ زندگی کیا ہے؟ ان کے آداب زندگی کیا ہے؟ اور اخلاقیات وغیرہ تہذیب کا موضوع ہیں ایرانی تہذیب میں آداب اور اخلاقیات کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایرانی تہذیب کا تاریخی پس منظر، اسلامی اثرات اور فارسی زبان پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایرانی تہذیب میں دوسرے افراد کی عزت واحترام کرنا بہت اہم ہے۔ ایک دوسرے کی عزت نفس اور ان کی آراو غیرہ کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ خاندانی رشتوں کی قدر کرنا ایرانی تہذیب کا اہم حصہ ہے۔ ایرانی تہذیب میں مہمان نوازی کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ مہمان کی حفاظت کرنا اور ان کی ضیافت کرنا اہم فرض سمجھا جاتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں خوش آمدید کا اظہار کرنا، معروف اخلاقی طرز عمل ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے محبت اور تواضع کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ایرانی تہذیب میں عدل و انصاف کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ عدل وانصاف کے اصول کو پاس رکھا جاتا ہے اور مختلف قوانین اور اصولوں کے تحت انصاف کا نفاذ کیا جاتا ہے۔ ایرانی تہذیب میں مذہبی اخلاقیات کا بڑا حصہ ہے۔ مذہبی اقدار کے تحت اخلاقی اقدار اور اصولوں کی پابندی کی جاتی ہے۔ ایران میں بسنے والے لوگوں میں آداب اور اخلاقیات کی اعلیٰ صفات پائی جاتی ہیں جو کہ

ایک مہذب قوم کی عکاسی کرتی ہیں۔ایرانی قوم میں اٹھنے بیٹھنے، کھانا کھانے کے آداب، ملنے جلنے کا سلیقہ میں سب سے آگے ہے۔

ایرانیوں کے آداب کے حوالے سے فرخ سہیل یوں لکھتے ہیں:

> آدابِ زندگی ایرانیوں پر ختم ہیں۔ جس طرح اس راہ گیر لڑکی نے مجھے رخصت کیا، ہمارے ہاں کوئی محبوب بھی اپنے عاشق کو ایسے رخصت نہیں کرتا۔ چہرے پر مسکراہٹ اور خدا حافظ کے ساتھ دعائیہ کلمات اور سب سے بڑھ کر انداز بیان۔ [۸]

ایرانی تہذیب میں ادب و احترام کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ بات کرتے ہوئے انتہائی شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ایرانی قوم بہت نفیس ہے، پیش کرنے کے انداز ایرانیوں کے ہاں بہت دلچسپ ہے اور ان کے کھانے پینے، پیش کرنے کے انداز میں نفاست پائی جاتی ہے۔

فرخ سہیل گوئندی یوں رقم طراز ہیں:

> جب مجھے پہلی مرتبہ ایک ایرانی دکان دار نے دونوں ہاتھوں سے بقایا نوٹ واپس کیے، اس انداز کو میں کبھی نہیں بھلا سکا اور پھر میں نے ہمیشہ ہی ایرانیوں کو ایسا ہی ملنسار پایا۔ [۹]

زبان و بیان اظہار کا وہ طریقہ ہے جس سے کسی قوم کے مہذب ہونے کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ بات کرنے کا انداز، گفتگو اور بول چال سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ قوم کس قدر مہذب ہے۔ایرانی قوم کا شمار مہذب قوموں میں ہوتا ہے۔عام زندگی میں ایرانیوں کے زبان و بیان کا طریقہ نہایت عمدہ ہے۔ فارسی ایران کی قومی زبان ہے۔ عام بات چیت، ملاقاتیں، سرکاری خطوط وغیرہ میں فارسی زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ایرانیوں کا اندازِ بیان عموماً پر تکلف نہیں ہوتا بلکہ دوستانہ ہوتا ہے۔ادب و بیان کے قواعد کی پابندی کی جاتی ہے اور احترام کے ساتھ بات کی جاتی ہے۔عام زندگی میں ایرانیوں کا رویہ برادرانہ ہوتا ہے۔ایرانیوں کی بات چیت عموماً مود بانہ ہوتی ہے۔لوگ دوسروں کے ساتھ احترام کے ساتھ پیش آتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی حیثیت کا خیال رکھتے ہیں۔ان کے بات کرنے کے ڈھب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ قوم کس قدر مہذب ہے۔ان کے طور اطوار میں نفاست جھلکتی ہے۔

فرخ سہیل لکھتے ہیں

> آپ کسی دکاندار سے سودا خریدتے ہیں وہ جس ادب کے ساتھ شکریہ ادا کر کے آپ کی بقایا رقم آپ کے ہاتھوں میں تھماتا ہے، ایسا ہمارے ہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ایرانی کھانے پینے، ملنے جلنے، دستر خوان اور دیگر حوالوں سے سلیقے میں اپنی مثال آپ ہیں امام رضا کا روضہ تو نہایت مقدس اور احترام کی جگہ ہے۔ یہ آداب ہمیں ایران میں ہر جگہ دیکھنے کو ملے۔ [۱۰]

خوراک انسان کی بنیادی ضروریات میں شمار ہوتی ہے۔ہر انسان اس بات میں دلچسپی رکھتا ہے کہ دوسرے خطے میں بسنے والے کس قسم کی خوراک کھاتے ہیں اوران کے ذائقے میں ایک خاص قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں۔ قوموں کا اپنا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور مزاج کی نوعیت پر اس خطے کے جغرافیے اور آب و ہوا کا بھی ایک خاص دخل ہوتا ہے۔ جس طرح کا قوموں کا مزاج ہوگا اس طرح خوارک پر بھی اثر ہوتا ہے۔ قوموں کے مزاج اور خوراک کے درمیان تعلق پر موجود ہوتا ہے۔خوراک کی قسم، ترتیب اور ذائقہ ایک قومیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ خوراک قومی روایات کا اظہار کرتی ہے اور انہیں زندہ رکھتی ہے۔ مثلاً مہمانوں کی قومی خوراک سے مہمان نوازی کرنا انھیں اپنے کھانوں سے آشنا کرواتا ہے۔خوراک قومی مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ قومی خوراک ایک قوم کی شناخت اور تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خوراک کی ترتیب، ترکیب، مصالحے اور ذائقہ وہاں کی قومی شناخت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ایرانی قوم کے حوالے سے " روٹی"، "کباب" اور دودھ کے بغیر " چائے" کا ایک تصور موجود ہے۔

جس کا مشاہدہ فرخ سہیل نے سفر کے دوران کیا اور اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> قیمق (دہی کی ملائی) کا ایک پیالہ، چھوٹی پیالی شہد اور طویل قامت نان۔ساتھ ہی گرما گرم چائے دودھ کے بغیر۔دنیا بھر میں چائے دودھ کے بغیر ہی پی جاتی ہے، سوائے ان ممالک کے جہاں جہاں برطانوی کولونیل ازم مسلط رہا ہے۔ برطانوی سامراج نے ہی ہمیں چائے میں دودھ ملا کر پینے کا سبق دیا جو ہم آج بھی بخوبی نبھا رہے ہیں بلکہ ہم اس قدر فرمانبردار نکلے کہ ہیں کہ ہم نے چائے سے پانی بالکل نکال دیا اور دودھ میں پتی ڈال کر "دودھ پتی" لے آئے۔(۱۱)

لسی ایک مشروب کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔اس کی تاثیر ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے عموماً گرم خطے کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لسی کا استعمال جنوبی ایشیا میں زیادہ کیا جاتا ہے، خاص طور پر ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ میں لوگ بہت شوق سے پیتے ہیں۔ لسی کے استعمال کے حوالے سے پنجاب بہت مشہور ہے۔

جبکہ فرخ سہیل اپنے سفر نامے میں اس تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> تخم مرغ (انڈہ) اور نان، اور ساتھ دہی کی نمکین لسی۔ ہم سمجھتے ہیں ہمارے ہاں لسی بہت پی جاتی ہے۔ ایرانی، ترک اور وسط ایشیائی، لسی کا استعمال ہم سے کہیں زیادہ کرتے ہیں مگر صرف نمکین۔(۱۲)

ایران کی قومی زبان فارسی ہے جسے فرخ صاحب شیریں زبان قرار دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے سفر نامے میں جگہ جگہ فارسی الفاظ سے متعلق تعارف کروایا اور دعوتی کھانوں میں گفتگو کے دوران جن فارسی الفاظ کو برتا، اُن تمام الفاظ کے ساتھ اُن کے معنی بھی بتائے مثال کے طور پر "حاجی آغا وایسید"(جناب عالی رکو)، "ہیچ" (کچھ نہیں)، "فروش گاہ ژل ژلہ"، "فروش گاہ گلِ یخ"، "دفتر گشت گیری" (ٹورسٹ آفس)، "سلام آغا" اور "آب میوہ ہائی

امید''(امید فروٹ جوس) وغیرہ اس کے ساتھ وہ جن بازاروں اور جگہوں سے گزرے ان کے نام کا تذکرہ بھی کرتے ہیں ۔ جیسے'' دانش گاہ ایران'' ، ''بازار بزرگ''،''کاخ گلستان''،''اصفہان''،''پردیسان '' ، ''رباطِ ترک''،''ہستی جان دل جان'' ، ''چشمۂ علی''،''کوچک'' اور'' دھودھک'' وغیرہ۔

لباس کسی بھی قوم کی شناخت ہوتا ہے۔جب کسی قوم کا تہذیبی مطالعہ کیا جاتا ہے تو جہاں اس بات کو مدِ نظر رکھا جاتا کہ اس قوم کا رہن سہن کیسا ہے ؟رسوم ورواج کیا ہیں ؟بول چال،اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ دیکھا جاتا وہیں اس قوم کا لباس بھی دیکھا جاتا ہے کیونکہ لباس کسی قوم کی تہذیبی شناخت میں اہمیت کا حامل ہے ایران میں انقلاب سے پہلے اور بعد میں ایرانیوں کے لباس میں بھی تبدیلی آئی۔انقلاب ایران میں ۱۹۷۹ء سے قبل اور بعد میں جہاں معاشرتی،سیاسی اور دینی اثرات مرتب ہوئے وہیں دینی اثرات نے لباس پر بھی اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ایرانی عوام کے لئے دینی لباس پہننے پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔دینی لباس پہننے کی وجہ سے عوام میں یکسانیت کی تشکیل کرتا ہے اور دینی لباس نے عوامی معاشرتی تقسیم کو بڑھایا۔ایرانی مردوں کے لباس میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔عورتوں کے لباس میں بھی تبدیلی آئی۔ عموماً چادر اور عبایا کا استعمال معمول بن گیا۔ایرانی عوام کی فن و آرائش میں بھی تغیرات واقع ہوئے۔انقلاب ایران نے لباس کو ایران کی ثقافتی،سیاسی اور دینی ترجیح کی مثال بنادیا۔اس نے معاشرتی اور سماجی تقسیم کو بڑھایا اور عوامی لباس پہننے کا طریقہ تبدیل کر دیا۔ایران میں انقلاب سے قبل مغربی لباس کا استعمال ملتا ہے لیکن انقلاب کے بعد ایرانیوں کے لباس میں تبدیلی آگئی۔

جس کا تعارف کرواتے ہوئے فرخ سہیل لکھتے ہیں:

> عورتیں سیاہ چادروں میں ڈھکی چھپی تھیں ۔کچھ نے جدید سکارف سے سر ڈھانپ رکھے تھے۔ مردوں میں خط شدہ ڈاڑھی اکثر نظر آتی تھی ۔سیاہ پوش ایرانی خواتین چادر کے نیچے جینز اور سکرٹ پہنتی ہیں۔مردوں نے سوٹ بھی پہن رکھے تھے،مگر نک ٹائی کے بغیر۔نک ٹائی کے بغیر سوٹ۔ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد ٹائی باندھ لی جائے تو غیر اسلامی سمجھا جاتا ہے۔(۱۳)

کسی بھی خطے کی آب وہوا اس علاقے اور اُس کے مکینوں پر بہت اثرات مرتب کرتی ہے۔جس علاقے کی آب وہوا جیسی ہوگی اس کے مطابق ہی اس علاقے کا رہن سہن،لباس،پیداوار اور خوراک وغیرہ ہوگی۔ مثلاً اگر کسی خطے کی آب وہوا گرم مرطوب ہے تو وہاں کے مکین ہلکا لباس اور ٹھنڈے مشروبات اور سادہ کھانوں کا استعمال زیادہ کریں گے اسی طرح اگر آب وہوا سرد اور موسم ٹھنڈا ہے تو لباس،خوراک اور رہن سہن کا طریقہ بھی اسی مناسبت سے ہوگا۔ ایران میں مختلف موسم ہیں، دسمبر اور جنوری میں سردی اور شدید برفباری ہوتی ہے اور موسم سرد ہوتا ہے اسی طرح بہار میں موسم سردی کی نسبت کچھ بہتر ہوتا ہے اور گرمیوں میں شدید گرمی پائی جاتی ہے۔

طویل سفر اور وسیع صحرا پہلی مرتبہ کوئی صحرا دیکھنے کا تجربہ ہوا اور خشک صحرا میں پتھر ایسے بکھرے پڑے تھے جیسے یہاں پتھروں کی بارش ہوئی ہو۔ اگست کے مہینے میں دشت لوط کی بیابانی اور خشکی بیان سے باہر ہے۔ ایران کے صوبے کرمان، سیستان و بلوچستان میں واقع دشت لوت دنیا کا ستائیسواں بڑا صحرا ہے۔ دشت لوت، دنیا کی سب سے گرم اور خشک ترین سرزمین ہے۔ تین سو میل طویل اور دو میل چوڑا دشت لوت۔ یہاں گرمی کی شدت ۱۵۹ فارن ہائٹ ہوتی ہے۔ (۱۴)

تعمیرات، فنون، رقص و موسیقی وغیرہ کسی قوم کی ذوق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ عمارتوں کی تعمیرات اور نقش و نگار تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے۔ جس طرح لباس، خوراک، رسوم و رواج کسی قوم کی تہذیب میں اہمیت رکھتی ہیں اسی طرح عمارتیں اور ان کے ڈیزائن بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایران کا شمار وسط ایشائی ممالک میں ہوتا ہے، ایران ایک قدیم تہذیبی ملک ہے جس کی تاریخ میں مختلف امپائرز اور حکومتیں رہ چکی ہیں۔ اس وجہ سے ایران میں کئی مختلف ادوار کی عمارتیں پائی جاتی ہیں جو اس تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہاں کی عمارتیں اور ان پر بنے نقش و نگار پوری اسلامی تہذیب کا گہوارا سمجھے جاتے ہیں۔ ایران میں اسلامی طرز کی عمارتیں کثیر تعداد میں موجود ہیں اور ان پر بنے نقش و نگار پوری دنیا کے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مشہد ایران میں واقع ایک شہر ہے جو پوری دنیا میں موجود اہل تشیع کے لیے مرکز نگاہ ہے۔

اس کی عمارتوں کا تعارف فرخ صاحب یوں کرواتے ہیں:

یہ (مشہد) دنیا بھر میں اہل تشیع کے لیے مقدس شہر ہے۔ قدیم ایرانی طرزِ تعمیر، مگر جدید انداز میں بنی عمارتیں۔ ایرانی جدت پسندی نے اپنے قدیم اندازِ تعمیر کو بھلا نہیں دیا۔ مشہد اس حوالے سے ماڈل شہر ہے۔ (۱۵)

مشہد، ایران کا ایک مقدس شہر ہے جہاں بہت سی تاریخی عمارتیں پائی جاتی ہیں یہ عمارتیں اسلامی تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں۔ مثلاً حرم مطہر امام رضا (علیہ السلام) کی عمارت مشہد کا سب سے مقدس مقام ہے۔ حرم مطہر میں حضرت امام رضا (علیہ السلام) کی قبر موجود ہے اور یہ مسلمانوں کیلئے ایک مقصد زیارت ہے۔ گنبد سلطانیہ مشہد کی مشہور عمارت جس کو یونیسکو کے تاریخی ورثہ کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ مسجد گوہر شاد بادشاہی عہد میں بنائی گئی ،اس کی عمارتوں میں ایرانی فن تصویر اور نقاشی کی خصوصیتیں نمایاں ہیں۔ برج خراسان کی عمارت مشہد کا بلند ترین برج ہے یہ چہل مناروں پر مشتمل ہے اس سے مشہد کا خوبصورت منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ مشہد کی عمارتیں تہذیبی وراثت کی عکاسی کرتی ہیں اور آنے والے سیاحوں کو تاریخی اور فنی خوبصورتی سے لطف اٹھانے کا موقع دیتی ہیں۔

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں مشہد شہر کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

مشہد ایک خوبصورت اور صاف ستھرا شہر ہے۔اہل تشیع کے لیے نہایت مقدس شہر۔امام رضاؑ کا روضہ مبارک، دنیا میں فن تعمیر کے حوالے سے ایک مثال عمارت ہے۔سونے، چاندی، شیشے، سنگ سرخ اور کیا قیمتی چیز نہیں جو اس مقدس عمارت میں استعمال نہ کی گئی ہو۔(۱۶)

ایران میں انقلاب سے قبل شاہی دور حکومت تھا، شاہی دور میں جو محلات تعمیر کیے گئے ان کا شمار دنیا کے قدیم ،خوبصورت اور عالی شان محلات میں ہوتا تھا ان محلات اور ان کے اندر موجود تخت کی تعمیر اس دور کے مشہور نقاشوں نے کی۔ تخت مرمر جو شاہی دور کا سب سے قدیم تخت تھا ایران کا تخت مرمر ایرانی تہذیب کی اہم عمارتوں میں سے ایک ہے۔ تخت مرمر اصل میں قاجار سلطنت کے شاہوں کا قصر تھا، لیکن اب یہ عوام کے لئے بھی کھول دیا گیا ہے۔ تخت مرمر کی عمارت ایرانی تہذیب اور نقش و نگارش کی خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔ تخت مرمر ایرانی تہذیب کا اہم تاریخی مقام ہے اور اس کی عمارتوں میں تہذیبی عناصر اور فنون کو بروئے کار لایا گیا ہے۔اس کی وضاحت سفر نامے میں اس طرح کی گئی۔

کاخ گلستان کے محلات میں تخت مرمر سب سے قدیم تخت ہے۔۱۷۴۷ء میں اس کی تیاری کا آغاز ہوا اور تین سالوں میں یزد کے مشہور زمانہ زرد سنگ مرمر کے پینسٹھ حصوں کو کاٹ اور تراش کر بنایا گیا۔شاہی دربار کے مشہور نقاش مرزا بابا شیرازی (نقش باشی) نے اسے ڈیزائن کیا اور شاہی صنم تراش محمد ابراہیم صفہانی نے اس کی تراش خراش کی۔عورتوں اور مردوں کے مجسمے اس تخت کو اپنے کندھوں اور سروں پر لیے کھڑے ہیں۔(۱۷)

شاہی دور کے وقت میں، ایران کے محلات میں نوادرات، نقش و نگارش اور دیگر فنون کی عکاسی ملتی ہے۔ نقش و نگارش بھی شاہی دور کی تہذیب کا اہم جزو تھا۔ایرانی فنونِ نقاشی کا یہ دور خاص طور پر مشہور تھا۔ عمارات کی دیواروں پر نقشوں کو تشکیل دیا جاتا تھا۔شاہی دور کے زمانے میں تصویری فنون کے علاوہ، ملک میں زرگری، جواہرات بھی اہم تھے۔ شاہی دور کی تہذیب کی عکاسی مختلف فنون سے ہوتی ہے اور ایرانی تہذیب کی خصوصیات منظرِ عام پر لاتی ہے۔اس کے علاوہ، اس دور کی تہذیب کی عکاسی سے محلات کی تشہیر کی جاتی ہے۔اس کا مقصد عوام کو ملکی فنون کے بارے میں آگاہ کرنا اور تاریخی میراث کی حفاظت کرنا تھا۔

اس حوالے سے فرخ سہیل لکھتے ہیں:

محلات خزانوں اور نوادرات سے اٹے پڑے ہیں اور شاہی انداز ہی میں سجے ہیں۔ مختلف ادوار میں دنیا بھر سے خریدی گئیں پینٹنگز، کراکری، کرسٹل، چھتوں پر لٹکے فانوس، فرش پر بچھے رنگ برنگے قالین دیواروں، کھڑکیوں پر نقش کاری اور فرنیچر اور قیمتی شاہی لباس، سونے چاندی کے برتن ،ہیرے جواہرات۔(۱۸)

ایران پہلے فارس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ایرانی تہذیب قدیم تہذیبوں کا گہوارا سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی عمارتیں قدامت اور جدت کا امتیاز ہیں۔ایرانی قوم اپنی قدیم تہذیب سے جڑی ہوئی ہے اور یہاں قدیم طرز کے بازار اب بھی موجود ہیں۔ نقشِ جہاں جو ایک شہر ہے اس کی تصویر کشی میں ہوں جہاں گرد میں یوں کی گئی۔

وسیع و عریض میدان اور چاروں طرف محل، مسجد، صفوی دور کی شاندار ایرانی فن تعمیر کے تحت عمارات اور قدیم طرز بازار۔۔۔۔وہاں پر موجود مسجد شاہ، سات رنگوں کی ٹائلوں سے سجی یہ مسجد صفوی دور کا ایک عظیم الشان تعمیری فن پارہ ہے۔ مسجد شاہ کا گنبد نقش جہاں کا دل ہے۔ وسعت سے ابھرا، رنگین ٹائلوں سے لدا گنبد اپنی اہمیت اور وجود کو نمایاں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ (۱۹)

مشرق وسطیٰ میں عرب ممالک کے علاوہ ایران اور ترکی بھی شامل ہیں۔ ترکی اپنی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کی وجہ سے لاکھوں سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ فرخ سہیل گوئندی نے ۱۹۸۳ء میں ترکی کا سفر کیا اور اس دوران جو مشاہدہ کیا اس کو اپنی تصنیف میں بیان کر دیا۔ ان کے سفر نامے میں جہاں ترکی کی تاریخ کو بیان کیا گیا وہیں ترکی تہذیب کو بھی موضوع بحث بنایا گیا۔ ہر قوم کی اپنی تاریخ اور تہذیب ہوتی ہے جس سے اس کی ایک قومی شناخت بنتی ہے۔ تہذیب کے عناصر میں عقائد، جغرافیہ، زبان، اقدار و روایات اور طبعی حالات وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام پہلو مل کر قوم کے افراد کی ضروریات، عادات و اطوار اور اقدار و روایات تشکیل دیتے ہیں۔ ریاض انور کا کہنا ہے۔ ''تہذیب ہماری حیات کے ظاہری پہلو کا نام ہے بر خلاف اس کے ہمارے اندرونی اور داخلی افکار و احساسات ہماری ثقافت کو آشکار کرتے ہیں۔''(۲۰) مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی میں جس معاشرہ کو تشکیل دیا وہ اس پر غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کی چھاپ تھی، اس لئے ترکی کی عوام پر سیکولرازم کی چھاپ نظر آتی ہے اور پوری دنیا میں ایک سیکولر ملک کے طور پر جانا جاتا ہے۔

فرخ سہیل صاحب جب ترکی کے سفر پر گئے تو انھوں نے اس بات کا گہرا مشاہدہ کیا، سیکولرازم اور مذہب کے حوالے سے یوں بات کرتے ہیں:

جب پچھلی گلیوں میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ شہر کے مکینوں کا معیار زندگی کیا ہے۔ ایک دو گلی کے بعد کوئی نہ کوئی مسجد ضرور تھی۔۔۔۔۔اور قابل غور بات کہ اذانیں بھی بہت خوش الحان۔ ترکی کی تمام مساجد سرکار کے نظم و ضبط میں ہوتی ہیں۔ امام سرکاری تنخواہ دار اور اس کی تعلیمی قابلیت الٰہیات میں ماسٹر ڈگری اور موذن کا خوش الحانی کا لازمی کورس۔ اور ہر مسجد میں اذان لازمی بھی نہیں۔ اگر ایک محلے میں دس مساجد ہیں اور دو میں اذان سارے محلے تک پہنچ سکتی ہے تو اذان دو مساجد ہی میں ہو گی۔ مساجد وغیرہ میں کانفرنسوں وغیرہ کی نہ تو اجازت ہے اور نہ ہی تصور۔ میں

دیکھ رہا تھا کہ مساجد میں نمازیوں کی تعداد اسلامی جمہوریہ ایران اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی اور نمازی بھی بڑے متحمل مزاج نظر آئے۔(۲۱)

تہذیب کا تعلق قوموں کے تشخص سے ہے۔ تہذیب کی عمومی تقسیم دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک قسم وہ جس میں ظاہری امور و مسائل کو بیان کیا جاتا ہے مثال کے طور پر لباس، خوراک، قوموں کا چال ڈھال اور رسوم و رواج وغیرہ۔ جبکہ دوسری قسم جس کا تعلق قوم کی جذباتی اور روحانی زندگی سے ہے۔ جس سے اس قوم کے نظریات، افکار و خیالات، جذبات واحساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر سید عابد حسین کا کہنا ہے:

تہذیب نام ہے ان اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے۔ جسے وہ اپنے اجتماعی ادارت میں ایک معروضی شکل دیتی ہے جس سے افراد اپنے جذبات ور جحانات اپنے لبھاؤ اور برتاؤ میں اور ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادی اشیاء پر ڈالتے ہیں۔(۲۲)

ترکی میں ترکی زبان بولی جاتی ہے، ترک قوم اپنی زبان سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس کا ذکر فرخ سہیل نے اپنے سفر نامے میں نمایاں طور پر کیا اور کہیں کہیں وہ ہمیں ترکی زبان کے الفاظ سے بھی روشناس کرواتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''حوش گیل دنیز'' (خوش آمدید)، ''اک مک'' (روٹی)، '' سپارش''(آرڈر)، ''اکی تانے'' (ایک عدد)، ''تشکر ایدرم''، (بہت شکریہ)، اور ''قہولتے'' (ناشتہ) وغیرہ۔ ترک قوم ایک تو زبان کے معاملے میں بہت جذباتی ہے اور دوسرا ترکی میں ہر جگہ چاہے کوئی بھی عمارت ہو اس پر لازمی ترکی کا پرچم ہوتا ہے۔ ترکوں کی قوم پرستی کی مثال سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں یوں ملتی ہے۔

ارضِ روم پہنچنے تک ترکی کا ایک منفرد پہلو دیکھا۔ وہاں پہنچنے تک میں نے یہ راز پالیا کہ ترک کس قدر قوم پرست ہیں، ترک گھروں، عمارات، ہوٹلوں کے استقبالیوں، دکانوں کے اندر، بینکوں غرض یہ کہ ہر جگہ ترکی کا پرچم (Baryak) لازمی ہے اور اس طرح ہر قصبے میں مصطفیٰ کمال پاشا کا مجسمہ اور ان کے نام پر شاہراؤں کے نام۔(۲۳)

تہذیب کا اثر انسان پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اور تہذیبی روایات واقدار کسی پر زبردستی مسلط نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ آہستہ آہستہ ایک انسان پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔ تہذیب کا معاشرے پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ اگر کوئی فرد اس سے بغاوت کرے تو اس کو قبول نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خلاف آوازیں بلند ہو جاتی ہیں۔ تہذیب کی اہمیت ڈاکٹر سید عابد حسین یوں بیان کرتے ہیں۔

اس کے سب سے زیادہ مشہور معنی ہیں پاکیزہ و پسندیدہ اخلاق وآداب۔ جس شخص کی طبیعت، چال ڈھال، گفتگو اور برتاؤ میں ایک خاص موزونیت اور دلکشی ہو مہذب کہلاتا ہے۔ بعض اوقات،

تہذیب کا لفظ اس سے زیادہ مجرد اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے یعنی زندگی کا مکمل نصب العین جو کسی قوم کے سامنے ہو۔(۲۴)

کسی قوم کی خصوصیات، عادات، اطوار، رہن سہن، لباس اور خوراک وغیرہ اس قوم کی تہذیب کی بنیاد ہوتی ہیں۔ ہر تہذیب میں کچھ ایسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو دوسری تہذیب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہر قوم میں کچھ مشترکہ خصوصیات اور جغرافیائی، تاریخی، مذہبی اور اخلاقی عناصر جو باہم روابط کے باعث موجود ہوتے ہیں۔ ہر تہذیب میں دوسری تہذیبوں کے پہلو بڑی حد تک ملتے ہیں لیکن ان کے انداز میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہی فرق فرخ سہیل گوئندی نے ایران سے ترکی جا کر محسوس کیا اور وہ فرق چائے کے استعمال کا فرق تھا۔ نوآبادیات سے متاثر ممالک کے علاوہ ترک سیاہ چائے کا استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے استعمال میں فرق کو فرخ صاحب نے یوں بیان کیا:

سیاہ چائے پینے کا تجربہ ایران میں بھی ہوا تھا، صرف سرحد بدلنے سے چائے کا نیا انداز پایا۔ ایرانی چینی کی ڈلی منہ میں رکھ لیتے ہیں جبکہ ترک سیاہ چائے کے ساتھ چینی کی دو ڈلیاں فراہم کرتے ہیں ۔ چائے چینی کے بغیر ہو یا چینی کے ساتھ یہ آپ کی مرضی ہے، مگر ایک اور بنیادی فرق بھی دیکھا ۔ ایرانی چائے کا گلاس ترک چائے کے گلاس سے دو تین گنا بڑا ہوتا ہے۔ ترک چائے کا گلاس سو ملی لیٹر سوا سو ملی لیٹر سے بڑا نہیں دیکھا اور ایرانی چائے کا گلاس دو ڈھائی سو ملی لیٹر سے کم نہیں ہوتا۔(۲۵)

ترکی کا شمار مسلم ممالک میں ہوتا ہے۔ چونکہ ترکی کا کچھ حصہ یورپ میں شمار ہوتا ہے اس لیے ترکی پر مغربی اثرات بے حد نمایاں ہیں۔ مغربی اثرات نے ترکی پر مختلف طریقوں سے متاثر کیا ہے۔ یہ اثرات تاریخی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، ادبی و فنونی نوعیت کے ہیں۔ مغربی سیاسی نظریات اور اصولوں کا ترکی پر اثر رہا ہے۔ یہ اثرات سیاسی تنقید، حکومتی نظامات، انتخابات اور قانونی نظام میں نظر آتے ہیں۔ تجارتی روابط اور اقتصادی نظامات کے ذریعے مغرب ترکی کی اقتصادی ترقی پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ مغربی طرز زندگی کا اثر بھی ترکوں نے قبول کیا جس نے ترک معاشرتی ساخت کو متاثر ہوتا ہے۔ اس نے ترکی کے ہر شعبہ زندگی پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ مغربی رسومات، زبان، ادب اور فنون نے ترکی پر اپنے گہرے اثرات ثبت کیے ہیں۔ مغرب سے برآمد کیے گئے تعلیمی نظامات، تحقیقی ادارے اور علمی ترقی نے ترک تعلیمی نظام کو متاثر کیا ہے۔ مغربی اصول، تعلیمی نظریات، اور تجربات ترک تعلیمی نظام میں شمولیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان تمام اثرات کے باوجود، ترک اپنے خاص تاریخی اور تہذیبی معیارات کی حفاظت کرتے رہے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُن کے لباس، رہن سہن اور طور اطوار میں جدت پائی جاتی ہے۔ ترک قوم ایک آزاد خیال اور جدت پسند قوم مانی جاتی ہے۔ ترکی میں شراب کا استعمال ایک متنازع موضوع ہے۔ یہاں ترکی کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ترکی میں شراب کی تیاری اور استعمال تاریخی حوالہ رکھتی ہے۔

اسلامی ترقی کے بعد سے پہلے ترکی کے لوگوں کی زندگی میں شراب کا استعمال زیادہ تھا لیکن اس کا استعمال بعد میں محدود ہوا۔ عثمانیوں کے عہد میں شراب کی تیاری اور استعمال کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ ترکی اسلامی ریاست ہے اور شراب کا استعمال اسلامی شریعت کے تحت ناجائز ہے، لیکن ترکی میں شراب کا قانونی استعمال ممکن ہے۔ ترکی میں شراب کے استعمال کے حوالے سے قوانین موجود ہیں۔ مصنوعی مشروبات، مثلاً بیر اور رم وغیرہ ترکی میں قانونی طور پر مسترد ہیں اور ان کی فروخت و استعمال پر پابندیاں ہیں۔ البتہ شراب کی تیاری اور استعمال مختلف ریستوراں، بار، اور خصوصی مقامات پر محدود طور پر جائز ہے۔ شراب کا استعمال ترک قوم میں ملتا ہے لیکن وہ شراب پینے کے لیے ترکی اصول وضوابط کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔

فرخ سہیل گوئندی لکھتے ہیں:

> مسجد کے عین سامنے بازار کے شروع میں شراب کی ایک بڑی دکان تھی جس پر مشہور زمانہ ترک بیئر EFES Pilsen کا نیون سائن لگا تھا۔ ایک شخص جو کچھ دیر پہلے میں نے مسجد میں دیکھا، وہ اب دکان سے Efes کا بڑا کریٹ اٹھائے جاتا نظر آیا۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا اور میری نگاہیں اس کا پیچھا کرنے لگیں۔ بازار کے اندر دیگر دکانوں کے بیچ چلتا گیا، اسکی جی (کچے قیمے کے کوفتے) کی دکان تھی جہاں پہنچ کر اس نے بیئر کا کریٹ فریج میں لگا دیا۔[۲۶]

ہر قوم اپنے مذہب، جغرافیائی حالات اور اپنی ضرورتوں کے تحت تعمیرات، لباس، رسم و رواج اور عادات کو اپناتی ہے۔ ترکی میں ستمبر کے بعد موسم انتہائی سرد ہو جاتا ہے ستمبر میں درجہ حرارت ۸/۱۰ ڈگری سے نیچے چلا جاتا ہے اور سردیوں میں منفی ۷/۶ ڈگری لیکن اس کے برعکس گرمیوں میں یہاں کا موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ ترکی میں بھیڑیں پالنے کا رواج بہت زیادہ ہے۔ اور گرمیوں میں کھلی جگہوں پر بھیڑیں چرانے کے لیے لائی جاتی ہیں۔ ترک قوم اور بھیڑ کا تعلق بہت گہرا ہے، گھروں میں موجود بھیڑوں کے مجسمے اور ان کی تصاویر اور ترک قوم کا آپس میں سر ٹکرا کے ملنا بھائی چارے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ فرخ سہیل صاحب اپنے سفر نامے میں ہوں جہاں گرد میں اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

> دور ایک پہاڑ کی ڈھلوان پر سینکڑوں کی تعداد میں بھیڑیں، ترک دنبے سر جھکائے چارہ کھا رہے تھے۔ سب کی گردنیں زمین کی جانب جھکی ہوئیں تھیں، ان کے پیچھے ایک گڈریا اور اس کے ساتھ بڑی جسامت کے چار کتے۔ ترکی اور ان علاقوں میں کتے اس قدر بڑی جسامت کے ہوتے ہیں کہ خوف آنے لگتا ہے۔ یہ سارا خطہ گرمیوں میں گڈریوں کی چراگاہیں ہے آنے والے ماہ ستمبر میں کیشین ہوائیں اس قدر سرد ہو جائیں گی کہ جانور اور انسان یوں آسانی سے گھوم پھر نہ سکیں گے۔ ترک تاریخی طور پر گڈریے ہیں اور ترک قوم کا بھیڑ سے تعلق اس قدر گہرا ہے کہ آج بھی ہر

> دوسرے ترک گھر کے ڈرائنگ روم میں سجاوٹی بھیڑیں عام نظر آتی ہیں۔ ترکوں میں ہاتھوں کے مصافحے سے زیادہ قربت کا اظہار کرنا ہو تو دونوں ملاقاتی ایک دوسرے کے ساتھ دائیں بائیں جانب بھیڑوں کی طرح اپنے ماتھے سے ٹکریں مارتے ہیں۔ یہ آپس میں ترک بھائی چارے کا اظہار ہے۔(۲۷)

ترکی کی سرحدوں پر زیادہ کرد قومیں بستی ہیں۔ کرد قومیں ایک متنوع تہذیب رکھتی ہیں جو ان کی تاریخ، زبان، فرہنگ، رسومات، ادب، اور اقتصادی حیثیت پر مبنی ہوتی ہے۔ کرد قومیں ایک قدیم تاریخ رکھتی ہیں جو اسلامی، عثمانی، صفوی، اور دیگر امپائرز کے حکمرانی کے دوران شامل ہوتی ہے۔ کردوں کی زبان کردی ہے۔ یہ زبان ترکی، عربی، فارسی، اور انگریزی کے الفاظ پر مشتمل ہے۔ کرد قوموں کی تہذیب میں رنگین رسومات کا اہم حصہ ہے۔ وہ تہواروں، مذہبی تقریبات، اور دیگر خصوصی مواقع پر خاص نغموں اور رقص کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ کرد قومیں گھوڑے پالنے کی شوقین ہیں اور ان کے پاس اعلیٰ نسل کے گھوڑے موجود ہوتے ہیں۔ یہ لباس میں گھیرے دار پھیلی ہوئی شلواریں استعمال کرتے ہیں اور یہ لباس ایران، عراق، ترکی اور شام میں موجود تمام ترک ہی استعمال کرتے ہیں۔ ترکوں کی گوشت خوری کے رسیا ہونے سے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ کس طرح ریستورانوں میں دنبے کی سریاں بھنی ہوئی اور ابلی ہوئی شوکیس میں سجا کر رکھی ہوتی ہیں وہ دنبے کے کسی حصے کو بھی خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں اس لیے اوجڑی اور سری پائے کا سوپ بھی بڑی باقاعدگی سے فروخت کیا جا رہا تھا۔ ترکی قوم کی عادات، خورد نوش، گوشت خوری کی تفصیلات ملتی ہیں یہ لوگ زیادہ تر بھیڑ کا گوشت کھاتے ہیں۔ جس کا ذکر گوندی صاحب یوں کرتے ہیں:

> جگر، دل، کھدیں، زبان مغز، دنبے کی سری بھنی ہوئی اور گوشت کے قتلے اور دنبے کا جو بھی عضو میسر تھا وہ سیخوں پر چڑھا ہوا تھا اور کرد و ترک بلا رنگ و نسل غول کی شکل میں کھانے کے لیے جمع تھے۔ گوشت سے چربی اتارنا تو یہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔(۲۸)

کرد کردستان سے منسوب وہ قوم ہے جو ایران، ترکی، عراق، اور آرمینیا میں بستی ہے۔ اس قوم کے باشندے مختلف علاقوں میں بسنے کے باوجود بھی وہاں کی تہذیبوں سے الگ اپنی تہذیب اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ قوم الگ تہذیبی وراثت رکھتی ہے جو اخلاقیات، زبان، فنون، رسم و رواج، روایات، اقدار اور رہن سہن پر مشتمل ہے۔ یہ تہذیبی وراثت انھیں دوسری قوموں سے ممیّز کرتی ہے۔ کرد زبان جو فارسی زبان سے قریب ہے، اس تہذیب کا ایک اہم جزو ہے۔ ترکی میں ان پہلوی دور میں ان کی زبان پر پابندی عائد کر دی گئی تھی لیکن کردوں نے اس کے خلاف زبردست آواز بلند کی اور اپنی زبان اور شناخت کے لیے لڑے اور اس کی حفاظت کی۔ کرد تہذیب میں فنون کا اہم حصہ ہے جس

میں موسیقی، نغمہ، رقص، نقاشی اور سنگ تراشی وغیرہ شامل ہے یہ فنون کرد تہذیب کی رنگینی کو ظاہر کرتی ہے۔ کرد تہذیب کی ایک اہم پہچان ان کی اخلاقیات ہیں۔ ان کی تہذیب میں معاشرتی رویوں، نیک خواہشات، خاندانی نظام اور ان کے اصولوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ کرد تہذیب میں رسوم و رواج کا بھی اہم کردار ہے۔ مقامی تہوار، شادیاں، مذہبی تقریبات اور جنگجوئی وغیرہ ان کی تہذیب کی تشکیل میں شمار کی جاتی ہیں۔ قومیت اور سیاسی تنازعات کی وجہ سے کرد تہذیب پر دباؤ آتار ہتا ہے۔ کچھ ممالک کرد قوم کی خود مختاری، قومیت اور ان کے حقوق کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ترکی اور ایران وغیرہ ان کو الگ اور خود مختار کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے کرد تہذیب کی ثقافت کے ہونے کی تشویش ہے ترک قوم اپنی زبان، ثقافت اور حقوق کے لیے مطالبے کرتی رہتی ہے۔ کرد ایک متنوع اور روشن فکر کی مالک کی قوم ہے۔ ان کے ہاں موسیقی، شعر اور رقص کو ایک خاص مقام حاصل ہے کردی زبان تہذیب کا اہم ترین جزو ہے۔ گو ئندی صاحب نے اپنے سفر کے دوران ترکی کی سرحدوں پر واقع کرد علاقوں کی سیر کی اور اس دوران انھوں نے کرد باشندوں سے ملاقات بھی کی اور ان کی تہذیب کا قریب سے مطالعہ کیا۔

جس کا ذکر وہ میں ہوں جہاں گرد میں یوں کرتے ہیں:

> گرکان اپنی شاہین کو چلا نہیں اڑا رہا تھا۔ بڑی سڑک عبور کرنے کے بعد اس نے اپنی ترک گاڑی شاہین کے ایک کچے راستے پر اتار دی۔ ہمارا رخ ارارات کی طرف ہے۔ سامنے میرا گاؤں ہے گل پوژو۔ دہقان، مرد وزن، موسم سرما کی تیاریوں میں مصروف تھے کھیتوں میں خشک گھاس کے ڈھیروں پر مٹی لیپ رہے تھے۔ خواتین نے بھی کرد شلواریں اور متعدد نے پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ کرد طرز زندگی میں بڑے روشن خیال ہوتے ہیں، کسی بھی طرح وہ ترکوں سے کم روشن خیال نہیں۔(۲۹)

کرد قومیں دیہات میں آباد تھیں ان کے گھر زیاد تر کچے مٹی اور گارے کے بنے ہوئے تھے۔ کرد قومیں گھوڑے پالنے کے علاوہ بھیڑیں پالتی ہیں اور ان کا آمدنی کا ذریعہ یہی بھیڑیں اور زراعت ہے۔ دوران سفر فرخ سہیل گو ئندی نے کرد علاقوں کا مشاہدے کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں۔

> دوغبایزت سے تقریباً ایک سو کلو میٹر بعد ایک شہر کے آثار دکھائی دیئے۔ مکانوں کی تعمیر ملی جلی تھی۔ زیادہ تر گارے اور پتھر کے بنے مکان اور کچھ فلیٹ، ٹریکٹر ٹرالیاں اور زرعی آلات کے ورکشاپ اس بات کی عکاسی کرتے تھے کہ اس علاقے میں معیشت کا دارو مدار زراعت پر ہے۔(۲۹)

ترکی میں جانوروں کے حقوق کو محفوظ رکھنے کیلئے کئی قوانین اور اقدامات موجود ہیں۔ ترکی میں حیوانوں کے حقوق کو تنظیم کرنے والے قوانین موجود ہیں جو جانوروں کی زندگی، خوراک، پناہ، اور علاج کو تنظیم کرتے ہیں۔

قوانین میں حیوانوں کے تشدد، تجارت وشکار پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ ترکی میں حیوانوں کی حفاظت کے لئے کمیٹیاں تشکیل کی گئی ہیں اور خاص جگہیں بنائی گئی ہیں ان جگہوں پر جانوروں کو آزادی، خوراک، پناہ، اور دیکھ بھال فراہم کی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں شکار، وغیرہ پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ ترکی میں عوامی آگاہی بڑھانے کے لئے جانوروں کے حقوق کے بارے میں آموزشی پروگرامز اور تربیتی کاروائیاں بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ ترکی بین الاقوامی سطح پر بھی حیوانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مختلف ممالک اور عالمی تنظیموں کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ ترکی میں عوامی سطح پر بھی جانوروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مختلف غیر سرکاری اداروں کے ذریعے اقدامات کئے جاتے ہیں۔ عوامی اداروں کے ذریعہ حیوانوں کی نگہبانی اور حفاظت کی جاتی ہیں۔ ترکی میں جانوروں کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے یہاں بیشمار اقدامات کیے جاتے ہیں۔ یہ اقدامات انسانی سوچ اور جانوروں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی جانب اہم قدم ہیں۔ اسلام میں جانوروں کے حقوق پر بھی بات کی گئی ہے۔ جانوروں کا خیال رکھنے اور انھیں اذیت دینے سے بچاؤ کی تلقین کی گئی ہے۔ ترکی میں لوگ جانوروں سے محبت کرتے اور ان کا خیال رکھتے ہیں۔ ترکی میں جانوروں کا خیال حکومت کی ذمہ داری ہے جسے وہ باخوبی پورا کرتی ہے۔

جانوروں سے ترکوں کی محبت کو سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا:

> آدھی رات کو تو بس سلطان احمت کی گلیوں کے ان کتوں کا راج ہوتا ہے جو سارا دن لوگوں سے خدمت کرواتے ہیں۔ ترکی کے کتے سائز میں چیتے سے کم نہیں اور سارے ترکی میں گلیوں کے کتے دھتکارے ہوئے کتے نہیں بلکہ پالتو کتے ہوتے ہیں۔ بلدیہ والے ان کو انجکشن لگا کر کان میں ایک ٹوکن لگا دیتے ہیں۔ بلدیہ کی تصدیق سے جدید ترکی میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو کسی حد تک پورا کرتے ہوئے دیکھا کہ "دریائے فرات کے کنارے بھوکے کتے کا بھی میں ذمہ دار ہوں۔" مجال ہے کہ کوئی گلیوں کے کتوں کو پتھر مارے یا دھتکار ہی دے۔۔۔۔ اس طرح راہ چلتے عام لوگوں کی طرف سے کی جانے والی ان کی دیکھ بال قابل تحسین ہے۔ ترک اسی طرح گلیوں میں جنم لینے اور وہیں رہنے والی بلیوں کا بھی خیال کرتے ہیں۔ جگہ جگہ کتوں اور بلیوں کی خوراک اور پانی کا انتظام ہے۔ (۳۰)

ایران میں بازار بزرگ اور ترکی میں گرینڈ بازار کے نام سے جانے جاتے ہیں جو پوری دنیا کے سیاحوں کے لیے ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ ترکی میں واقع یہ بازار مصنف کے لیے بھی خصوصی کشش رکھتا ہے جو اسے وہاں لے گئی۔ جیسے بعض مقامات اپنی خاصیت کی وجہ سے ایک الگ پہچان رکھتے ہیں اور ان کے بغیر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ آپ کی اس خطے کی سیر نامکمل ہے جیسے پیرس میں واقع ایفل ٹاور اور استنبول میں واقع آیا صوفیہ۔ اسی طرح میں ہوں جہاں

گرد کے مصنف کے نزدیک ترکی میں واقع گرینڈ بازار کو دیکھے بغیر سیاحت نامکمل سمجھتے ہیں اور اس کا تقابل بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ گرینڈ بازار کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں۔

> استنبول کے گرینڈ بازار میں داخل ہوا تو مجھے لگا میں تہران میں کے بازار بزرگ میں آگیا ہوں۔ ان دونوں بازاروں میں ناموں کا بھی فرق نہیں۔ فرق صرف دونوں زبانوں کا ہے، "بیوک بازار" ویسے ہی جیسے فارسی میں تہران کا "بزرگ بازار" یعنی بڑا بازار۔ ہاں ترک اسے "کپالی چارشی" (بند بازار) بھی کہتے ہیں۔ استنبول کے اس صدیوں پرانے تاریخی گرینڈ بازار کی ۶۴ گلیاں اور ۲۲ دروازے ہیں۔ ہر طرف رنگ برنگی مختلف اشیا سے سجا ہوا بازار پایا۔[۳۱]

خوراک کسی بھی قوم اہم تہذیبی پہلوؤں میں شمار ہوتی ہے۔ کسی بھی خطے کے جغرافیائی حالات اور موسمی صورت حال اس علاقے کی ضروریات اور خورد و نوش کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ لوگ جہاں دوسرے خطے کے تہذیبی پہلوؤں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں وہیں خوراک کے بارے میں بھی کھوج لگاتے ہیں۔ تقریباً سبھی سفر نامہ نگاروں کے ہاں مختلف علاقوں کی اشیائے خورد نوش کا ذائقہ چکھنے اور ان کے کھانوں کے بارے میں جاننے کے حوالے سے دلچسپی ملتی ہے اور یہی دلچسپی فرخ سہیل گوئندی کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ وہ دوران سفر مختلف واقعات، مشاہدات اور دلچسپ تجربات سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ وہاں کے کھانوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ ترک قوم گوشت خور ہے۔ گوشت کے بنے مختلف کھانے ترکوں کی مرغوب غذا میں شمار ہوتے ہیں۔ ترکوں کی گوشت خوری کا مصنف میں ہوں جہاں گرد میں اس طرح تذکرہ کرتے ہیں۔

> آگے چلا تو ایک ریستوران کے شوکیس میں دنبے کی اُبلی اور بھنی سریاں آنکھوں سمیت سجی تھیں۔ قریب جا کر دیکھا تو وہاں اوجڑی کا سفید سوپ، سری اور پائے کا سوپ بھی فروخت ہو رہا تھا۔ ریستوران کا مالک دنبے کی سری کے بھنے ہوئے قتلے کاٹ کاٹ کر سرو کر رہا تھا۔۔۔ ترک، وسطی ایشائی اور کاکیشا کے لوگ تو گوشت خوری میں ہم سے بہت آگے ہیں بلکہ ہمارے جنوبی ایشیا میں گوشت خوری کا رواج انھی خطوں سے آیا۔ ان کے جانوروں کو گوشت کھانے کا رواج ہم سے زیادہ ہے اور ترکوں کا پسندیدہ گوشت گھوڑے کا ہے۔[۳۸]

تہذیب کسی معاشرے یا خطے میں مروج رسومات، روایات، رہن سہن، اخلاقی اقدار اور فکر و نظریات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ قوم کی پہچان تہذیب پر منحصر ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تہذیب میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات بیرونی حملے، طاقتیں اور دوسری قوموں کا اس خطے پر قابض ہونا اور وہاں آکر بسنا بہت سی تہذیبی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات ایک ہی جگہ پر مختلف قوموں کے ایک ساتھ رہنے سے نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔

استنبول، ترکی کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے یہ ملک کا اقتصادی، تجارتی اور سیاسی مرکز ہے۔ استنبول ایک قدیم شہر ہے جس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ یہاں مختلف تاریخی مقامات موجود ہیں جیسے کہ آیا صوفیہ پیلس میوزیم اور گلاٹا ٹاور وغیرہ۔ یہاں کے مقامات ترکی تہذیب اور تاریخ سے جڑے ہوتے ہیں۔۔ استنبول کا ہار مونیوم ہنر، موسیقی، قومی رقص، اور فلمی ورکشاپس بھی ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔ استنبول ایک تجارتی شہر ہے جہاں مختلف بازاروں اور بازاروں کی تشکیلات موجود ہیں۔ گو ئندی صاحب نے استنبول کے حوالے سے مختلف زمانوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جس میں بڑی جامعیت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہاں یونانی لاطینی، آرمینیائی، فارسی اور عثمانی دور اہم ترین رہے ہیں۔ ان کے اثرات اس شہر کی تعمیرات پر بھی نظر آتے ہیں۔ مختلف تہذیبوں اور قوموں کے ایک دوسرے کی تعمیرات لے اثرات پر اثر انداز ہونے کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے آیا صوفیہ کا انداز تعمیر کے مساجد کی تعمیر پر اثرات بیان کیے گئے ہیں

> کئی تہذیبوں نے اس شہر میں جنم لیا اور پھر یہ تہذیبیں دنیا کے مختلف براعظموں میں پھیل گئیں جیسے بازنطینی اور عثمانی تہذیبیں یہاں سے ابھریں اور ایشیا، افریقہ، یورپ تک پھیلتی چلی گئیں۔ انھیں عروج ملا اور پھر زوال ہو گیا مگر یہ شہر پھر زوال آشنا نہیں ہوا۔ (۳۳)

دنیا کے تقریبا ہر بڑے شہر میں ایک رونق اور رش ہوتا ہے جہاں پورے ملک کے شہری معاش کی تلاش میں آتے ہیں ترکی میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں سارا دن ایک گہما گہمی اور رش ہوتا ہے انہی میں سے ایک استنبول میں واقع گلاٹا پل ہے جہاں سارا دن چہل پہل اور ایک عجب میلہ ہوتا ہے جس کی تصویر فرخ صاحب یوں کھینچتے ہیں۔

> میں رکے بغیر گلاٹا پل کی طرف چل پڑا۔ پل کے نیچے بھی ریسٹوران اور تمام کے تمام ''بالک ریسٹوران''۔ وہاں ادھر سے ادھر سڑک پار کرنے والوں کا جم غفیر تھا، سٹے بیچنے والے، شربت ،'' لوکم مٹھائی بیچنے والے (لوکم، جلیبی کی تکنیک کے مطابق ایک گول مٹھائی جو ایک لقمے میں کھاتے ہیں، عربی کے لفظ لقمے'' سے ترکی زبان میں ''لکم ''آیا)، کھلونے، جیکٹیں، کپڑے جوتے ہر شے فرش پر سجی تھی، اس لیے کہ ایمی نونو کے فٹ پاتھ کشادہ ہیں۔ (۳۴)

دوسری قوموں کی تہذیب میں تین پہلو ایسے موجود ہوتے ہیں جو کسی سیاح کو اپنی طرف کھینچتے ہیں پہلا پہلو یہ ہے کہ وہ سیاح کی تہذیب سے بالکل مختلف ہوتے ہیں دوسرا یہ کہ ان تہذیبی معیارات میں مماثلت پائی جاتی ہے اور تیسرا یہ کہ اس کی علاقے کی جھلک میں نیا پن موجود ہو۔ ترکی میں جس چیز نے مصنف کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی وہ وہاں کی صفائی کا نظام تھا۔ ترک قوم جدت پسند ہونے کے ساتھ صفائی پسند اور نفیس قوم ہے، شہر ہو یا گاؤں ترکوں کی زندگی میں ایک ترتیب موجود ہے اور ان کے ہاں صفائی کا انتظام بہت اعلیٰ ہے۔ ترکی میں صفائی اہم اور ضروری اصولوں پر مبنی ہے۔ ترکی میں صفائی کا تعلق صحت، حفظان صحت، اور مرکزیتِ تربیت سے ہوتا ہے۔ صفائی کو اہم اصول تصور کیا

جاتا ہے جو انسانی زندگی کو صحتمند، اور خوشگوار بنانے کیلئے ضروری ہے۔ ترکی میں شہری صفائی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ عوام کو صفائی کے اصولوں کا پابند بنایا جاتا ہے جن میں عوامی علاقوں کو صفائی کرنے کے لئے اقدامات، منصوبے، تربیت اور سفارشات شامل ہوتی ہیں۔ ترکی میں عوامی مقامات جیسے کہ پارک، باغات، مساجد اور بازار وغیرہ کی صفائی کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں کی عوام صفائی کے اصول وضوابط کو پابند رہتی ہے اور مقامات کی صفائی کا خیال رکھتے ہیں۔ ترکی میں عوامی تعلیمی اداروں میں صفائی کے اصول بھی سکھائے جاتے ہیں۔ اس طرح نوجوانوں کو صفائی کے اصولوں کا علم حاصل ہوتا ہے جو انہیں صفائی کا اہم حصہ بناتے ہیں۔ ترکی میں صفائی کا پابند بنایا جانا بہت اہم ہے۔ عوامی صفائی، مقامات کی صفائی، اور عوامی تعلیمی اداروں کی صفائی کے اصولوں کا پابند رہنا ترکی کو معاشرتی طور پر منظم اور صحت مند قوم بناتی ہے۔ ترک قوم کی صفائی پسند اور نظم وضبط کا تقابل انھوں نے برصغیر کے قصبات کے ساتھ بھی کیا ہے۔ وہاں کی خوش سلیقگی، تعمیرات میں تنظیم انھیں بہت پسند آئی۔ انھوں نے برصغیر کے حوالے سے یہ بات کہی کہ یہاں وہ ترتیب و تنظیم نہیں، ہم بستیوں کے آباد کرنے میں بڑے بے سلیقہ ہیں۔ یہاں عمارات ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا نظر آتی ہیں ایک زیرک سفر نامہ نگار کی طرح وہ بتاتے ہیں کہ وہاں صرف صفائی کے منصوبے اور حکومتی کارگردگی کی بدولت ہی نظم وضبط اور صفائی نہیں بلکہ ترک عوام بھی اس میں شانہ بشانہ شریک ہیں اور بحیثیت قوم ان میں خوش سلیقگی پائی جاتی ہے۔ گوئندی صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> سانجا جھیل جنت نظیر ہے اور ساتھ ساتھ سلیقے سے آباد بستیاں۔ برصغیر کے شہروں اور قصبات کی طرح نہیں جہاں داخل ہوتے ہی بے ہنگم تعمیرات، سڑک تک اڈے ہوئے مکانات اور تعمیرات ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے نظر آتے ہیں اور اس کے بعد تجاوزات اور گندگی کے ڈھیر استقبال کرتے ہیں۔ ترکی میں شہروں کا طرزِ زندگی یکسر مختلف ہے۔ تعمیرات یقیناً قومی مزاج و کردار کی عکاس ہوتی ہیں اور صفائی نظام بھی۔ (۳۵)

تہذیب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کسی قوم کے ذرائع آمدن یا ذریعہ معاش کیا ہے؟ ذرائع آمدن ملک کی معیشت پر اثر انداز ہوتے ہیں کیونکہ وہ ملک کی معیشتی ساخت کا اہم جزو ہیں۔ ذرائع آمدن سے ملک کی معیشت میں منافع اور تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ذرائع آمدن، جیسے بیرونی سرمایہ کاری، تجارت اور سیاحت کے ذریعے ملک کی مالیاتی بنیادوں کی تقویت ہیں۔ اس سے ملک میں سرمایہ کاری کے مواقع بڑھتے ہیں اور معیشتی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذرائع آمدن ملکی ارتقاء کو بڑھاتے ہیں۔ بیرونی سرمایہ کاری اور تجارتی روابط کے ذریعے نئے صنعتی ادوار کی تشکیل ہوتی ہے اور اقتصادی تعاون بڑھتا ہے۔ ذرائع آمدن معیشتی ترقی میں بڑی حد تک کام کرتے ہیں۔ بیرونی سرمایہ کاری، تجارت، اور سیاحت کی وجہ سے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، بیشتر لوگوں کو آمدنی کا ذریعہ فراہم ہوتا ہے، اور عوام

کی خریداری قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ذرائع آمدن سماجی اثرات پیدا کرتے ہیں جو ملکی معیشت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ ملکی توازن کو بھی متاثر کرتے ہیں۔اگر ذرائع آمدن متناسب طور پر تقسیم ہوں تو ملک کے مختلف علاقوں میں توازن کی صورت حاصل ہوتی ہے۔اس سے ملک کے نسلی امتیازات میں فرق کم ہوتا اور تفرقے کی کمی ممکن ہوتی ہے۔ذرائع آمدن کے اثرات معیشتی ترقی، ملکی توازن اور ارتقاء پر اثرانداز ہوتی ہے اس لئے ملکی حکومتیں عموماً ذرائع آمدن کو فروغ دیتی ہیں اور بیرونی سرمایہ کاری، تجارت اور سیاحت کو فروغ دینے کے لیے اہم اقدامات فراہم کرتی ہیں۔کسی بھی قوم کی ترقی و تنزلی کا اندازہ اس کے ذریعہ معاش سے ہوتا ہے۔ترک قوم میں کاروبار کرنے صلاحیت زیادہ ہے۔اس کے علاوہ ان کا پیشہ زراعت ہے۔ترکی میں واقع ازمت بندرگاہ ترکوں کی آمدن کا ایک بڑا ذریعہ ہے جس کا ذکر فرخ صاحب یوں کرتے ہیں۔

> ترکی میں سمندر صرف نظارے کے لیے ہی نہیں بلکہ سیاحت کا بھی سب سے بڑا ذریعہ آمدن ہے۔ترکی کے سمندر ساحل اربوں ڈالر کی آمدن کا ذریعہ ہیں۔جہاں یورپ کے سیاح اور ترک "بے نیاز" ہو کر پانی، ریت اور دھوپ سے لطف اٹھاتے ہیں۔اور ایسے ہی وہ سمندری راستے کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ازمت، استنبول سے مال آنے اور لے جانے کے حوالے سے ایک اہم بندرگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔بحیرۂ مارمرا، باسفورس کے آبی راستے سے بحیرۂ اسود سے جڑا ہوا ہے اور دوسری طرف ایک تنگ آبی راستے سے گیلی پولی چنک قلعے سے درۂ دانیال ساری دنیا کے سمندروں تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔[۳۶]

کسی بھی خطے میں موجود تعمیرات، عجائب گھر اور نقش و نگارش اس قوم کے ذوق اور اپنی تہذیب کے حوالے سے جاننے میں مدد دیتی ہیں۔ تعمیرات، نقش و نگار، مجسمے، اور عجائب گھر ایک ملک کی تہذیب کو بہت خوبصورت طریقے سے ظاہر کرتے ہیں۔تعمیرات ملک کی تہذیب اور فن صنعت و حرفت کو ظاہر کرتی ہیں۔یہ ملک کی تاریخ اور فنی روایات کا حصہ ہوتی ہیں۔تاریخی عمارات، مساجد، محل، قلعے اور مزارات ملک کی تہذیب کو نمایاں کرتے ہیں۔نقش و نگار ملک کی تہذیب اور ثقافت کو ظاہر کرتے ہیں۔یہ ملک کے فنون و آداب، رنگ و بناوٹ، اور تصویری ذہنیت کو بیان کرتے ہیں۔مجسمے بھی ملکی تہذیب کی اہم عنصر ہیں جو اس کی فن و صنعت، تاریخ اور ادب کو ظاہر کرتے ہیں۔تاریخی شخصیات کے مجسمے، فنی مجسمے، تصویری کارکنی، اور عام مقامات پر بنائے گئے مجسمے ملک کی تہذیب کو ظاہر کرتے ہیں۔عجائب گھر عام طور پر ملک کے مشہور تاریخی مقامات ہوتے ہیں جو ملکی تہذیب اور تاریخ کو ظاہر کرتے ہیں، آمدنی کا ذریعہ بنتے ہیں، سیاحوں کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں، اور ملک کی تہذیبی وراثت کی حفاظت کرتے ہیں۔مثال کے طور پر، تاج محل (Taj Mahal) ہندوستان میں، ایفل ٹاور (Eiffel Tower) فرانس میں، پیرامیڈز

(Pyramids)مصر میں، اور دیوارِ چین (Great Wall of China)ملک کی تہذیب کی مشہور یاد گاریں ہیں۔ ترکی کا شمار بھی ایسے ممالک میں ہوتا ہے جو ترقی اور جدت پسندی کے ساتھ اپنے ماضی کے ساتھ جڑی ہے اور اس سے گہری محبت کرتی ہے۔ مختلف زمانوں میں مختلف تہذیبیں ترکی کا حصہ رہی ہیں جس کو ترک قوم نے آج بھی محفوظ رکھا ہے۔ اور ترکی میں موجود عجائب گھر ترکی کی قدیم تہذیب کو محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ جس کو فرخ صاحب یوں بیان کرتے ہیں۔

> استنبول آرکیالوجی میوزیم، آثار اور نوادرات کا عظیم خزانہ ہے۔ یہ دنیا کے کسی بڑے میوزیم سے کم نہیں۔ ایک کے بعد ایک گیلری تھی۔ مختلف زمانوں اور تہذیبوں کے آثار، قدیم یونانی، بازنطینی دور، بازنطینی، قدیم عرب ادوار، سیرانی، سلجوق اور عثمانی ہر اس تہذیب کے آثار جہاں سلطنت عثمانیہ قائم رہی، نوادرات، زیورات، برتن، ہتھیار، سکے، مختلف تہذیبوں کا عظیم خزانہ، پتھر کے لاتعداد تابوت اور بہت کچھ۔ (۳۷)

ترکی میں بعض مقامات ایسے ہیں جن کی حیثیت مختلف ادوار میں مختلف رہی۔ کئی عمارتیں مختلف ادوار مثلاً یونانی، بازنطینی، سلجوق اور عثمانیہ دور میں مختلف مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ جیسے ایک ہی عمارت کبھی مندر، کبھی گرجاگھر، کبھی مسلمانوں کی عبادت کی غرض سے اور کبھی ڈپو کے طور پر استعمال کی گئی۔ توپ کاپی محل، ترکی کے استنبول شہر میں واقع ایک تاریخی عمارت ہے۔ یہ محل عثمانی سلطنت کی اعلیٰ خاندان کے لئے نمائندگی کرتا ہے۔ اس محل کا اندرونی حصہ دفتری امور کے لیے استعمال کیا گیا اور باہر کا حصہ عوام کے لیے کھول دیا گیا۔ فرخ سہیل گوئندی توپ کاپی محل کے اندر کا نقشہ بیان کرتے ہیں اور اس کے اندر موجود گرجا کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

> عثمانیوں نے قسطنطنیہ کے کئی گرجاگھروں کو مساجد میں تبدیل کر دیا مگر عثمانی محل کے اندر موجود یہ گرجا مسجد میں نہیں بدلا گیا بلکہ اسے شاہی ہتھیاروں کے ڈپو میں بدل دیا گیا۔ ڈیڑھ ہزار سال یہ پرانا اپنے دور کے فن تعمیر میں ایک عظیم شاہکار ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ۵۳۲ء میں گرجا کی تعمیر سے پہلے یہاں یونانیوں کا معبد تھا اور یہ گرجا آیا صوفیہ سے پہلے تعمیر ہوا، بلکہ اسے کانسٹنٹنوپل میں تعمیر کیے گئے پہلے گرجاگھروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آیا صوفیہ میں جہاں مشرقی رومن چرچ کا Patriachate بیٹھتا تھا، اس کی تعمیر سے پہلے یہ گرجاگھر مشرقی رومن مسیحت کا مرکزی گرجاگھر تھا، اس کلیسا کو ''آیا ایرین'' (مقدس امن) کا نام دیا گیا۔ بازنطینی دور میں کی یہ تعمیر ابھی تک اصلی حالت میں موجود ہے۔ اب یہ ایک عجائب گھر ہے۔ (۳۸)

عظیم قومیں ہمیشہ اپنے قائد کو یاد رکھتی ہیں اور ان کی یادگار تصویروں اور کارناموں سے آنے والی نسلوں کو آگاہ کرتی ہیں۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے ماضی کو نہیں بھولتیں۔ ترکی ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ ترک قوم میں قوم پرستی بہت زیادہ ہے، وہ اپنے وطن اور وطن سے جڑی ہر چیز سے بہت محبت کرتی ہے۔ مجسموں کا شمار ملک کی شاہکار تعمیرات میں ہوتا ہے، یہ تہذیب کی پوری داستان کو بیان کرتے ہیں۔ یہ آداب، فن، تاریخ، تفکر، اور ملکی ورثہ کی کہانی کو جسمانی روپ میں ظاہر کرتے ہیں۔ مجسمے تاریخی واقعات کو زندہ کرتے ہیں۔ وہ تاریخی شخصیات اور واقعات کو واضح شکل دیتے ہیں جو تہذیب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مجسمے کسی ملک کی ثقافتی داستان کو بیان کرتے ہیں۔ وہ ملکی آداب و رسوم، لباس، زبان، اور فنون کو دکھاتے ہیں۔ مجسمے ملک کی تہذیب کی پوری داستان بیان کرتے ہیں، ان کی شکل و صورت، تفصیلات، رنگ و بناوٹ، اور مواد اندوختہ تہذیب کی تفصیلات کو ظاہر کرتے ہیں۔ آمدنی کا ذریعہ بنتے ہیں، سیاحوں میں دلچسپی پیدا کرتے ہیں، اور ملک کی تہذیبی وراثت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ترکی میں جگہ جگہ نصب یادگاری مجسمے ترکوں کی اپنے ماضی سے جڑے ہونے کی علامت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ مجسمے خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک علامت اور اس کی پوری داستاں کو بیان کرتے ہیں۔ ترکی میں واقع استنبول شہر جو ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے، قدیم تہذیبوں کا سنگم ہے اس شہر میں قدیم اناطولیائی، سلجوق اور عثمانی قدیم تہذیبوں کا سنگم ہے یہ شہر قدامت اور جدیدیت کا حسین امتزاج ہے۔ اور یہاں نصب مجسمے اپنے اندر ایک پوری تاریخ کو اسمیٹے ہوئے ہیں۔

ترکی میں نصب مجسموں کی کہانی کا بیان میں ہوں جہاں گرد میں ان الفاظ میں ملتا ہے:

> مقبرے کی سمت جاتی اس شاہراہ کے آغاز پر تین ترک مردوں کے مجسمے۔ ہیلمٹ کور کوٹ پہنے دائیں طرف والا شخص ایک ترک فوجی کی نمائندگی کرتا ہے۔ بائیں طرف ہاتھ میں کتاب لیے ایک ترک نوجوان طالب علم ہے، ان دونوں کے پیچھے دہقانی لباس میں ایک ترک کسان کا مجسمہ ہے۔ اتاترک نے جمہوریہ ترکیہ کے قیام کے وقت کہا تھا:
>
> ''ترکی کسانوں کا۔''
>
> اتاترک کے اسی فلسفے کی عکاسی میں یہ مجسمے یہاں نصب ہیں۔ ان مجسموں کا مقصد جدید ترکی کے قیام اور کامیابی کا یہ فلسفہ پیش کرنا ہے کہ ملت کا دفاع، پیداوار اور تعلیم۔ تینوں مجسموں کے چہروں کے سنجیدہ تاثرات ترک عوام کی سنجیدگی اور قوتِ ارادیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ترکی کے قومی لباس میں ملبوس تین خواتین کے مجسمے ہیں۔ ایک ترک عورت اعتماد کے ساتھ کھڑی ہے ،اس کے ایک ہاتھ میں پیالہ اور اس میں گندم کے دانے، زرخیزی کے عکاس۔ اطراف میں موجود دونوں خواتین زمین تک پہنچی ہوئی چادر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اناج کی بوریوں سے بنی یہ چادر زرخیز ملک کی نمائندگی کرتی ہے۔ دوسری نے اپنا چہرہ دائیں ہاتھ سے ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ اپنے غازی

مصطفیٰ کمال پاشا کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جانے کے غم میں نڈھال ہے۔ یہ مجسمے ترک خواتین کے فخر، غم اور تکلیف میں بھی ان کے خلوص اور عزم کی نمائندگی کرتے ہیں۔(۳۹)

رسم ورواج معاشرتی قواعد اور عوام کی روزمرزہ کی عادات کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ کسی بھی علاقے کی معاشرتی اقدار کی تشریحات، آداب اور روزمرہ کی عادات کی وضاحت کرتے ہیں۔ رسم ورواج کسی بھی تہذیب کا سب سے اہم حصہ ہیں ہر قوم اور علاقے کے اپنے رسم ورواج اور رجحانات ہوتے ہیں۔ مذہب اور عقائد و نظریات اس علاقے کے رسم و رواج کو متاثر کرتے ہیں اکثر قوموں میں پائے جانے والے رسوم و رواج مذہب کے زیرِ اثر تشکیل پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی ممالک میں پائی جانے والی رسمیں اپنے مذہب اسلام کے تحت تشکیل دی جاتی ہیں۔ ترک قوم اپنے قائد سے بہت محبت کرتی ہے۔ ان کے ہاں ایک یہ رسم پائی جاتی ہے شادی کے بعد اگر شادی شدہ جوڑے انقرہ کا سفر کر سکیں تو ضرور اپنے قائد مصطفیٰ کمال پاشا کے مقبرے پر آتے ہیں۔

فرخ سہیل گوئندی اس منظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

> سیڑھیاں اوپر چڑھا تو ترک فوج کے سپاہی جو اپنے ملک کے بانی قائد کو ہر روز خراج تحسین پیش کرتے ہیں، یوں کھڑے تھے جیسے بت۔ نظریں اوپر نیچے کیے بغیر پلکیں بھی نہیں ہل رہی تھیں ۔۔۔ کئی نو بیاہتا جوڑے بھی آئے ہوئے تھے میں حیران ہوا کہ ایسا کیوں۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اکثر ترکوں میں رواج ہے کہ شادی کے بعد اگر وہ انقرہ آسکیں تو انت کبیر اپنے باپ اتاترک کی دعا و شفقت لینے آتے ہیں۔ انقرہ نہ آسکیں تو انت کبیر تو مختلف شہروں کی ان رہائشگاہوں پر جاتے ہیں جہاں جہاں غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے قیام کیا(۴۰)

کسی بھی فرد کا وہ طرزِ معاشرت اور نظام فکر جس میں اس کے عقائد و نظریات اور افکار و خیالات تشکیل پاتے ہیں اور جن کے زیر اثر انسان کی شخصیت تشکیل پاتی ہے تہذیب کہلاتی ہے۔ افراد کے خیالات و نظریات اور افکار سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ کس قدر مہذب ہیں۔ اور اس سے معاشرے کی ترقی و تنزلی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر اپنی کتاب مطالعہ تہذیب میں تہذیب کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں۔

> اصطلاحاً تہذیب سے مراد انسان کا نظام فکر ہے۔ یعنی انسان کے وہ عقائد و نظریات و افکار جن سے اس کی شخصیت بنتی اور سنورتی ہے۔ ان کے خیالات جتنے پاکیزہ روشن اور سلجھے ہوئے ہوں گے وہ معاشرے کا اتنا ہی مہذب شخص متصور ہو گا۔ تہذیب کا تعلق انسانی فکر و خیال اور ذہن سے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے تہذیب کی کیفیت نظریاتی، فکری، روحانی اور غیر مادی ہوتی ہے۔(۴۱)

سفر میں اہم چیز جس کا مشاہدہ دوران سفر ایک سیاح کرتا ہے وہ اس خطے کی تہذیب ہوتی ہے۔ تہذیب ہر معاشرے کی پہچان اور قوم کے لیے ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ افراد کی تقسیم جغرافیائی، ماحولیاتی، لسانیاتی اور نسلی

گروہوں کے اعتبار سے ہوتی ہے اور ہر گروہ کی اپنی عادات واطوار، نظریات،افکار، خیالات،عقائد جغرافیائی ضروریات اور خصوصیات ہوتی ہیں۔اردو سفر ناموں میں تہذیب کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ سفر ناموں کے مطالعہ سے اس خطے کے تہذیبی عناصر پوری طرح عیاں ہوتے ہیں۔سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں جہاں مصنف نے اس خطے کی تہذیب کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس خطے میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کا بھی ذکر تفصیلی کیا ہے۔

کسی معاشرے میں حالات بدلتے ہیں تو اسکے اثرات معاشرے کے ہر پہلو پر ہوتے ہیں، مثلاً معاشرے کی اقدار کو متاثر کرتے ہیں اور ان کا تعلق مروج فنون سے ہوتا ہے۔فرخ سہیل گوئندی نے تین ممالک کا سفر کیا اور ان کے نظریات اور تہذیبی پہلوؤں کا مشاہدہ عمیق نظری سے کیا ان کے سفر نامے میں تینوں ممالک کے نظریات اور افکار وخیالات کی عکاسی ملتی ہے۔ ترکی ایک سیکولر ملک ہے اور ایران کی بنیاد مذہب پر ہے جبکہ بلغاریہ ایک سوشلسٹ ملک ہے۔فرخ سہیل نے اپنے سفر نامے میں بلغاریہ کو یوں متعارف کرواتے ہیں۔

> اب میں بے چینی سے کاپتان آندریوہ ریلوے سٹیشن کی عمارت دیکھنے لگا۔ اشتراکی بلغاریہ کا سوشلسٹ ستارے والا پرچم اس کے ماتھے پر نام کے ساتھ پینٹ ہوا نظر آیا۔گاڑی اور سرکی تو چار قد آور تصاویر دکھائی دیں جن پر روشنیاں پڑ رہی تھیں۔سوشلسٹ بلغاریہ کے بانی دیمتروف کی تصویر، پیپلز ری پبلک آف بلغاریہ کے صدر ژیوکوف کی تصویر، کارل مارکس کی تصویر اور ایک بڑا سائیون سائن، سوشلسٹ آرٹ کا نمونہ، مزدور اور کھیتوں میں کام کرتے دہقان، ملوں کی چمنیوں سے نکلتا دھواں اور سر بلند کیے ایک نعرہ زن عورت جس کے ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں سرخ پرچم----(۴۲)

سوشل ازم قوم کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ سخت اور اکھڑ مزاج قوم ہوتی ہے۔ لیکن فرخ سہیل صاحب نے جب بلغاریہ جیسے سوشلسٹ ملک کا سفر کیا تو انھوں نے اس کے برعکس الگ پایا۔بلغاریہ کے لوگ امن پسند اور محنتی ہیں۔بلغاریہ میں صفائی کا نظام بہت اعلیٰ ہے اور یہاں اکثر جگہیں درختوں اور پھولوں سے سجی ہیں۔ بلغارین قوم حسین اور سادہ مزاج ہے۔فرخ سہیل گوئندی بلغاریہ کے ماحول کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں۔

> شام ہونے کو تھی۔لوگ سڑک کنارے رکھی میزوں کے گرد بیٹھے کافی اور مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ساتھ ساتھ خوبصورت پھول دار درخت، صفائی ستھرائی جو ابھی تلک اس سفر وسیاحت کے دوران کسی بھی شہر میں دیکھنے کو نہ ملی۔ حسین نوجوان اور بوڑھے مرد وزن خوش گپیوں میں مصروف، نہ گاڑیوں کا شور اور نہ ہی لوگوں کی ہڑبونگ۔صوفیہ کا مزید حسن اس شاہراہ پر پہنچ کر مجھ پر کھلنے لگا۔لوگ، ترتیب اور انداز زندگی سب کچھ مختلف پایا۔دلچسپ بات یہ کہ ذوق بھی مختلف پایا----زندگی کا واقعی ہی مختلف انداز اور حسین لوگ۔بلقان کا حسن تو اب دیکھا۔

نزاکت اور سادگی۔ جیسے نفسا نفسی اس بستی کے انسانوں میں ناپید پائی، ویسے ہی غرور، تکبر بھی
دیکھنے کو نہیں ملا۔[۴۳]

قوموں کے عروج و زوال کی بنیاد تعلیم یا تعلیمی نظام پر ہے۔ تعلیم کسی بھی قوم یا معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ معاشرے کا امن، استحکام اور توازن تعلیمی اداروں اور تعلیمی نظام پر منحصر ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اگر نوجوان نسل کو توازن اور برداشت کی اعلیٰ اقدار سکھائی جائیں تو یہ ملک کی سماجی معاشرتی اور معاشی ترقی میں نمایاں اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کا مقصد صرف اعلیٰ تعلیم کی فراہمی ہی نہیں بلکہ طلبا میں سماجی شعور کی بھی بیداری ہے۔ یہ افراد کو علم و فن، تجربہ، مہارتوں اور اخلاقی اصولوں کو ترقی دیتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے لوگ اپنی صلاحیتوں کو بڑھاتے ہیں اور اہم روابط، سوچ، تجربات کے ذریعے سے سماجی مسائل کو حل کرتے ہیں اور سماجی ترقی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بلغاریہ جو ایک اشتراکی ملک کہلوتا ہے وہاں کا تعلیمی نظام بہت اعلیٰ ہے۔ ان کے تعلیمی ادارے اپنے سماج اور تہذیب کی مکمل عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ فرخ صاحب نے ان تعلیمی اداروں کا ذکر اپنے سفر نامے میں بھی کرتے ہیں۔ بلغاریہ کا ایک شہر جو تعلیمی میدان کے حوالے سے پہچان رکھتا ہے اس کا تعارف یوں کرواتے ہیں۔

طالب علموں کا یہ شہر صوفیہ کے علاوہ "دورے نیسا" میں آباد ہے۔ میری منزل طالب علموں کی یہی بستی تھی۔ ایک عجب خاموشی اور سکون طاری تھا، کشادہ سڑکیں، سب کچھ کھلا، کوئی جنگلا نہیں، دیواریں نہیں، بیریئر نہیں۔ ایک کے بعد ایک عمارت، ایک کے بعد ایک تعلیمی درسگاہ، انہی درسگاہوں میں بلغاریہ کی مشہور ترین ایک یونیورسٹی بھی میرے سامنے آگئی

"Karl Marx Higher Institute of Economics"

ہر شعبہ تعلیم سے متعلق ادارے، یونیورسٹیاں، اقتصادیات، تاریخ، سیاسیات، لسانیات، میڈیکل کالجز، انجینئرنگ یونیورسٹیاں، ایک کے بعد ایک شعبے کی درسگاہ۔[۴۴]

عمارتوں کی تعمیر اور نقش و نگارش تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے۔ کسی خطے میں عمارتوں کی تعمیر، ان کی ہیئت اور نقش و نگار اس خطے کی تہذیبی اقدار کی وضاحت کرتی ہیں۔ عمارتوں کی تعمیر میں استعمال ہونے والے فن نقاشی، معماری اصول، ترتیب اور خاص ڈیزائین اس علاقے کی تہذیبی وراثت، روایات اور ثقافتی عناصر کی وضاحت کرتی ہے۔ ملکوں میں مجسموں کی تعمیر علامتوں کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مجسمے خاص مقاصد کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ جیسے اپنے رہبر کا مجسمہ بنانا اور ان کی شخصیت سے آنے والی نسلوں کو متعارف کروانا، اس کے علاوہ ملک کی تاریخ میں جن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا، اور بعض مجسمے کسی خاص قومی علامت مثلاً اتحاد وغیرہ اور قوموں کی معیشت کو متعارف کروانے والے مجسمے تعمیر کیے جاتے ہیں۔ یہ قوموں کی عظمت اور وقار کو علامتی طور پر متعارف کرواتے ہیں۔

> مزید چلنے کے بعد سوویت انقلاب کے بانی رہنما لینن کے بلند قامت مجسمے کے پہلو میں جا کھڑا ہوا جہاں پھول اور لاتعداد گلدستے رکھے تھے اور لوگوں نے وہاں چراغ بھی روشن کر رکھے تھے۔ پتھر کا تراش کر بنایا گیا لینن کا بلند قامت مجسمہ، دایاں ہاتھ جیسے تقریر کرتے ہوئے روسٹرم پر ہو، اور بائیں ہاتھ سے کھلا اوور کوٹ بیچ سے پکڑا ہوا اور چہرہ سامنے ''لارگو'' کی عظیم الشان عمارت کی طرف۔ ''لارگو'' بلغاریہ کی کیمونسٹ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر تھا جو اشتراکی شہر اور ملک کی پہچان تھی۔(۴۵)

فنون تہذیبی شناخت کا وہ شعبہ ہے جو مختلف تہذیبوں، معاشرتی جماعتوں اور معاشرتی روایات کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ شعبہ مختلف علوم اور مفاہیم کو آپس میں جوڑتا ہے تاکہ معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور تاریخی سیاق وسباق میں ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جاسکے۔ فنون تہذیبی شناخت تہذیبی عناصر، اصول، اقدار، روایات، نمونے، شخصیات و دیگر معاشرتی عوامل کی تفہیم اور تشریح پر توجہ دیتے ہیں۔ یہ شعبہ ان جماعتوں، معاشرتی روایات اور تہذیبوں کو درجہ بندی کرنے، سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فنون تہذیبی شناخت، ساجی معاملات، اجتماعی ضروریات اور معاشرتی روابط پر غور کرتی ہیں کہ سماج کیسے تشکیل پاتا ہے، معاشرتی روابط کیسے بنتے ہیں، اور معاشرتی تناؤ کیسے حل ہوتے ہیں۔ فنون تہذیبی شناخت سیاست، طبقاتی تفاوتیں، اقتصادی نظام اور سیاسی قوانین کی تجزیہ کرتی ہے۔ یہ دیکھتی ہے کہ کس طرح سیاستی تدابیر، طبقاتی تفاوتیں اور اقتصادی طریقے معاشرتی رویوں کو متاثر کرتے ہیں۔ فنون تہذیبی شناخت مختلف رسوم و روایات جیسے مذہبی روایات، شادی کے رسوم، جشنوں، سالگرہوں، مزارات و دیگر ثقافتی روایات کی تشریح اور تجزیہ کرتی ہے۔ فنون میں تہذیبی شناخت کی علامات مختلف طریقوں سے پیش کی جاتی ہیں، لیکن اس کا مشترکہ مقصد ہوتا ہے کہ معاشرتی عوامل کو سمجھا جائے اور تہذیبی تعلقات، روایات اور عوامل کی تفہیم میں ترقی کی جائے۔

موسیقی کسی ملک کی تہذیبی شناخت کا اہم حصہ بنتی ہے، اور اس کا اثر ملکی تہذیب پر ہوتا ہے۔ یہ کسی ملک کی تہذیبی تاریخ کو بیان کرتی ہے موسیقی ملک کی روایات اور رسوم کا حصہ بنتی ہے۔ ملکوں میں مختلف تہذیبی روایات اور رسوم موسیقی کو قدیمی اور تاریخی وراثت کا حامل ہوتی ہیں۔ موسیقی کسی ملک کے قومی اصول اور ذوق کو بیان کرتی ہے۔ مختلف قومیتوں کی موسیقی میں زبان، آلات، بناوٹ، مقامات اور مقامی طرز زندگی کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ موسیقی ملک کی تہذیبی عقائد اور تصورات کو بیان کرتی ہے۔ مختلف تہذیبوں میں موسیقی کو دینی، فلسفیانہ، روحانی یا دیگر تصورات کے مطابق تشریح کی جاتی ہے۔ بلغاریہ میں پیش کی جانے والی موسیقی کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں۔

ستمبر 9 سکوئر" میں گیورگی دیمتروف کے مقبرے سے ذرا پیچھے ہوا تو غیر مانوس طلسماتی موسیقی نے میرے کانوں میں رس گھول دیا۔ اور پھر میں اس ساز کی آواز کی رہنمائی میں اس طرف کھنچتا چلا گیا۔ میرے قدم ایک نہایت ہی خوبصورت پارک کی طرف بڑھنے لگے۔ کیمونسٹ راہبر کے مقبرے کے عین پیچھے ساز کی آواز میرے قدموں کے قریب ہونے لگی۔ وہاں ایک شخص مشک اٹھائے عجب ساز بجا رہا تھا اور جو عورت اس کے ساتھ گا رہی تھی، وہ اس "سرخ جنت" کی حور لگ رہی تھی۔ اس عجب آلۂ موسیقی کو دیکھ کر حیرانی تو ہوئی، مگر پانی بھرنے والے سفید مشکیزے جیسے آلۂ موسیقی کا سوز اس کی ساخت سے بھی زیادہ انہونا اور ہوش ربا تھا اور اس کے ساز کے ساتھ "سرخ جنت" کی حور کی پرسوز آواز، اس حور کا حسن اور چہرے کی معصومیت، نا قابل بیان۔ ہاں واقعی یہ ایک مختلف دنیا تھی اور لوگ ساز و آواز کے اس جوڑے کے گرد ناچ رہے تھے۔(۴۶)

معیشت اور تہذیبی اقدار دو مختلف مفاہیم ہیں لیکن یہ دونوں آپس میں تعلق رکھتے ہیں۔ معیشت اقتصادی اور مالی پیمانے پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اقدار معیشتی ترقی، آمدنی کی تقسیم، ملکی تجارت، صنعت، روزگار کے حالات، ملکی آسودگی وغیرہ پر تاثر ڈالتی ہیں۔ تہذیبی اقدار وہ اصول و روایات ہیں جو ایک ملک یا معاشرتی جماعت کی تہذیب، اخلاق، ادب، زبان، روایات، رسوم، آداب و عادات کو بیان کرتی ہیں۔ یہ اقدار معاشرت، ثقافت اور اخلاقیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ تہذیبی اقدار میں ادب، شاعری، موسیقی، نقاشی، روزگار کے روزمرہ کے اعمال، افکار، اخلاقیاتی اصول، روایات، اسلامی آداب و عادات کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ معیشت اور تہذیبی اقدار ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں، کیونکہ معیشتی ترقی کی فقط اقتصادی حیثیت کو نہیں بلکہ معاشرت اور ثقافت کا حصہ ہیں۔ اسی طرح تہذیبی اقدار معیشتی ترقی اور مالی امکانات کے بغیر نامکمل تصور کی جاتی ہیں، کیونکہ ترقی کے لئے معیشتی استحکام ضروری ہے۔ کسی ملک کی معیشت کا انحصار کس پر ہے؟ یہ تہذیبی مطالعے میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ذرائع آمدن خاص حیثیت ملک کی معیشت پر خاص اثرات مرتب کرتے ہیں۔ بلغاریہ کے شہر صوفیہ کا احوال لکھتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح ملک کی معیشت پر اثرانداز ہوتی ہیں۔

شہر میں داخل ہونے سے پہلے عیاں ہو رہا تھا کہ یہ کوئی بڑا صنعتی شہر ہے، بڑے کارخانے اور مزدوروں کے حوالے سے بڑے سائن بورڈز۔ اس نامعلوم شہر میں داخل ہونے لگے تو وہاں شہر کے نام کا بورڈ آویزاں تھا "Dimitrovo"۔ میرے مشاہدے کے مطابق جب آپ کسی شہر میں داخل ہوں تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شہر کی معیشت کیا ہے صنعتی ہے کہ زرعی۔ دیمتروف کو سراسر صنعتی پایا، سڑک پر چلنے والی ٹریفک بھی اس کے صنعتی ہونے کی عکاس تھی۔ صوفیہ کے مضافات جہاں ختم ہو جاتے ہیں، وہیں یہ شہر شروع ہو جاتا ہے۔ اس شہر نے اشتراکیت کے

بعد بہت اہم صنعتی حیثیت حاصل کر لی۔ ستور ما دریا کے کنارے آباد اس صنعتی شہر میں آلودگی نام کی کوئی شے نہ تھی۔ دیمتروف، بلغاریہ میں سٹیل ملز سے لے کر ہیوی انڈسٹریز اور کان کنی کے حوالے سے اقتصادی کردار ادا کرنے والا شہر ہے۔(۴۷)

درآمدات برآمدات ملک کی معیشت پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ کسی ملک کی ترقی کا اندازہ اس کی درآمدات اور برآمدات سے ہوتا ہے۔ بلغاریہ میں مصنف کی ملاقات تین کیمیونسٹوں سے ہوئی جن میں دو خواتین اور ایک مرد شامل تھا، جنھوں نے بلغاریہ کے حوالے آسے کافی معلومات سے انھیں آگاہ کیا، وہ ذرائع آمدن اور ملکی ترقی پر بحث کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔

اس مختصر آبادی کے ملک میں تین لاکھ لوگ کمپیوٹر انڈسٹری سے وابستہ ہیں۔ ہمارے ملک میں کمپیوٹر انڈسٹری سے سالانہ تقریباً ڈیڑھ ارب امریکی ڈالر کی پیداوار ہو رہی ہے، کیا یہ خبر آپ کے ملک یا کسی سرمایہ دار دنیا میں پہنچی؟ ہمارے سکولوں میں اب پورٹیبل کمپیوٹر سے تعلیم بھی دی جارہی ہے بلکہ اطلاعات تو یہ ہیں کہ امریکہ ہماری کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو چوری کرنے کے لیے بے چین ہے اور شاید چوری کرنے میں کامیاب بھی ہو چکے ہوں۔ ہمارا ملک سوشلسٹ ممالک کو ۴۰ فیصد کمپیوٹر برآمد کرنے والا ملک بن چکا ہے۔ اس طرح ایٹمی ٹیکنالوجی میں ہم کسی بھی سرمایہ دار ملک سے پیچھے نہیں۔ ہاں ایک فرق ہے کہ ہم اس ٹیکنالوجی کو اپنی حفاظت کے لیے استعمال کر رہے ہیں، بم بارود کے لیے نہیں۔ ایٹمی ٹیکنالوجی سے ہم اپنے ملک میں بجلی بناتے ہیں اور اسے علاج معالجے کے لیے بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ اب تو بلغاریہ بجلی درآمد کرنے والا ملک ہے۔ زرعی صنعت میں ہم دنیا میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ پولٹری، گوشت سمیت دیگر مصنوعات ہمارے ہاں سرپلس ہیں۔ اگر ہمیں عالمی منڈیوں تک معمول کی رسائی مل جائے تو یہ ہماری صنعت دنیا میں اپنا مقام بنا لے گی۔ بلغاریہ کی خلا تک رسائی اشتراکی نظام کی کامیابی کا ایک ثبوت ہے اور ہاں ہم ٹیلی فون کے صنعت میں معجزہ کر چکے ہیں۔(۴۸)

کسی ملک کی تعمیر و تشکیل میں بہت سے عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں مذہب ، معیشت ، طرز زندگی، ذرائع آمدن ، تعلیم اور اخلاقیات کا بڑا اہم ہاتھ ہوتا ہے۔ میں ہوں جہاں گرد میں مصنف نے مختلف تہذیبی حوالوں کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے رہن سہن، اخلاقیات، اقدار و روایات، معیشت، تعلیم اور قومی شعائر کا تذکرہ کر کے اس سفر نامے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔سبط حسن،پاکستان میں تہذیب کا ارتقا(کراچی: مکتبہ دانیال،۱۹۸۹ء)،ص ۱۳۔

۲۔مولوی سید احمد دہلوی،فرہنگ آصفیہ(جلد اول)،(دہلی: ترقی اردو بیورو،۱۹۸۷ء)ص ۶۵۱۔

۳۔سبط حسن،پاکستان میں تہذیب کا ارتقا(کراچی: مکتبہ دانیال،۱۹۸۹ء)،ص ۱۳۔

۴۔عابد حسین،قومی تہذیب کا مسئلہ (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو،۱۹۰۸ء)ص ۱۳۔

۵۔فرخ سہیل گوئندی،میں ہوں جہاں گرد(لاہور: جمہوری پبلی کیشنز،۱۹۲۱ء)ص ۶۹۔

۶۔ایضاً،ص ۱۷

۷۔ایضاً،ص ۱۱۳

۸۔ایضاً،ص ۷۸

۹۔ایضاً،ص ۶۱

۱۰۔ایضاً،ص ۳۶

۱۱۔ایضاً،ص ۷۷۔

۱۲۔ایضاً،ص ۸۴۔

۱۳۔ایضاً،ص ۶۳۔

۱۴۔ایضاً،ص ۳۲۔

۱۵۔ایضاً،ص ۳۴۔

۱۶۔ایضاً،ص ۳۶۔

۱۷۔ایضاًص ۵۹۔

۱۸۔ایضاً،ص ۵۹۔

۱۹۔ایضاً،ص ۱۷۔

۲۰۔ریاض انور، اصول تمدن (کراچی: مکتبہ نظامیہ،۱۹۵۷ء)ص ۳۱۸۔

۲۱۔فرخ سہیل گوئندی،میں ہوں جہاں گرد ،ایضاً،ص ۱۷۹۔

۲۲۔عابد حسین،قومی تہذیب کا مسئلہ(علی گڑھ:انجمن ترقی اردو،۱۹۵۵ء)ص۹۔

۲۳۔فرخ سہیل گوئندی،میں ہوں جہاں گرد ایضاً،ص۱۷۰۔

۲۴۔سید عابد حسین،قومی تہذیب کامسئلہ (علی گڑھ:انجمن ترقی اردو،۱۹۵۵ء)ص۱۵،۱۴۔

۲۵۔فرخ سہیل گوئندی،میں ہوں جہاں گرد(لاہور:جمہوری پبلی کیشنز،۲۰۲۱ء)ص۱۴۴۔

۲۶۔ایضاًص۱۷۸۔

۲۷۔ایضاً،ص۱۴۶۔

۲۸۔ایضاًص۱۵۲۔

۲۹۔ایضاًص۱۲۹۔

۳۰۔ایضاً،ص۴۵۹۔

۳۱۔ایضاً،ص۴۰۱۔

۳۲۔ایضاً،ص۳۹۷۔

۳۳۔ایضاً،ص۳۹۵۔

۳۴۔ایضاً،ص ۳۷۲۔

۳۵۔ایضاً،ص ۳۲۲

۳۶۔ایضاً،ص۳۲۳۔

۳۷۔ایضاً،ص۴۳۶۔

۳۸۔ایضاً،۴۴۲۔

۳۹۔ایضاً،ص۲۲۰۔

۴۰۔ایضاً،ص۲۲۵۔

۴۱۔نگار سجاد ظہیر،مطالعۂ تہذیب(کراچی:قرطاس گلستان جوہر بلاک،۲۰۰۰ء)،ص۱۷۔

۴۲۔فرخ سہیل گوئندی،میں ہوں جہاں گرد (لاہور:جمہوری پبلی کیشنز،۲۰۲۱ء)ص۵۳۵۔

۴۳۔ایضاً،ص۵۶۴۔

۴۴۔ایضاً،ص۵۶۷۔

۴۵۔ایضاً،ص۵۷۷۔

۴۶۔ایضاً،ص۵۸۷

۴۷۔ ایضاً ص ۲۲۷۔

۴۸۔ ایضاً ص ۵۳۱۔

باب چہارم:

میں ہوں جہاں گرد میں تاریخی، سیاسی، سماجی پیش کش

ادب زندگی کا آئینہ ہے، جس طرح انسان اپنی تاریخ کے ساتھ جڑا ہے اسی طرح ادب بھی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لیے ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے تاریخ کو ادب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ادیب اور شعرا معاشرے کے افراد ہیں ان کا تعلق تاریخ سے بہت گہرا ہے اور انسانی معاشرت کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا بیان ادب کی ہر صنف میں ہوا ہے۔ تاریخ کے ذریعہ ہم ماضی میں جھانک سکتے ہیں اور تاریخ میں انسان کے جذبات، واقعات اور مشاہدات محفوظ ہوتے ہیں۔ ادب کا سیاست کے ساتھ بھی گہرا رشتہ ہے کیونکہ ادب زندگی کے تمام امور کا احاطہ کرتا ہے اور سیاست زندگی کا حصہ ہے۔ ادب میں جدید اور کلاسیکل ادوار کا مطالعہ کیا جائے تو ادب میں سیاست کے اثرات نظر آتے ہیں۔ جس طرح تہذیب، تاریخ اور سیاست کا تعلق ادب سے جڑا ہوا ہے اسی طرح سماج کا بھی ادب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ تقریباً ہر ادیب کے ہاں سماج سے متعلق مواد ملتا ہے۔ اردو ادب کی خواہ کوئی بھی صنف ہو اس میں تاریخ، سیاست اور سماج کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ سفر نامہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ سفر نامہ نگار جب کسی خطے کا سفر اختیار کرتا ہے تو وہ وہاں کی تہذیب کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تاریخ، سیاست اور سماج میں بھی دلچسپی رکھتا ہے اور ان تاریخی، سیاسی اور سماجی عناصر کو اپنے سفر نامے میں بیان کرتا ہے۔

فرخ سہیل گوئندی ایک ادیب، دانشور اور پولیٹیکل سوشل ایکٹوسٹ کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ سیاسی سرگرمیوں میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں، اس کے علاوہ انھیں تاریخ سے گہرا لگاؤ ہے۔ ان کے سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں تہذیب کے ساتھ ساتھ تاریخ، سیاست اور سماج کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے ان کے سفر نامے میں یہ عناصر تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد اپنے اندر کئی موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس سفر نامے میں تاریخی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی موضوعات کے حوالے سے وسعت پائی جاتی ہے۔ موضوعات میں تنوع کے پیش نظر یہ باب تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔تاریخی عناصر

۲۔سیاسی عناصر

۳۔سماجی عناصر

۱۔تاریخی عناصر:

تاریخ اور ادب کے درمیان تعلق واقعات کے بیان سے ہے ،دونوں شعبوں کا تعلق بیانیہ تکنیک سے ہے۔ادب میں واقعات کو بیان کرنے کے لیے تخیل اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے جب کہ تاریخ میں ماضی کے حقیقی واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔تاریخ کی ابتدا انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔تاریخ کو قوموں کی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس حوالے سے زاہد حسین میر لکھتے ہیں:

> تاریخ کو سمجھنے کے لیے پورے عہد،اس کے سماجی ڈھانچے اور سماجی ارتقا کو سمجھنا ضروری ہے۔تاریخ میں فرد کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے تاہم تاریخ کی تفسیر و تخلیق صرف افراد ہی نہیں کرتے۔اس میں سماج کی اہمیت کا بھی خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔تاریخ پورے سماج کی ارتقا کی کہانی ہوتی ہے۔(۱)

تاریخ کا تعلق ماضی سے ہے اور وہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہے۔تاریخ کو ماہرین نے اس کی مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے جو تاریخ کے مطالعہ و تفہیم میں سہل ثابت ہوئے ہیں،ان میں سوانحی تاریخ،سیاسی تاریخ، جنگی تاریخ وغیرہ اہم ہیں۔ادب اور تاریخ کو الگ الگ شعبوں میں گردانا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود تاریخ کا ادب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ادب اور تاریخ کے آپس کے تعلق کی بنا پر ادبی تخلیقات میں تاریخی شعور کو بنیاد سمجھا جاتا ہے۔تاریخ کے بارے میں جاننے کے لیے زمان و مکاں کی شرط لازمی ہے۔کسی بھی عہد کی تاریخ کو اس کے زمانی و مکانی سیاق و سباق سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ادب میں تاریخی شعور سے مراد تاریخ کے واقعات کو سلسلہ وار بیان کر دینا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد معاشرے اور سماج کی حقیقتوں کو سمجھنا اور انھیں واضح کرنا ہے،ان حقیقتوں کو عام طور پر زمانی و مکانی تناظر میں بیان کرنا ہے۔تخلیقات میں زمان و مکان کے حوالے سے آگہی تاریخی شعور کی اساس ہے۔اس حوالے سے قراۃالعین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور میں اقتباس درج ہے۔

> اول تو یہ کہ ادب میں تاریخی شعور کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ ادب میں پورے انسانی سماج کی یا مختلف ادوار کی سلسلے وار تاریخ بیان کی جائے، بلکہ ادب میں تاریخی شعور سے مراد مختلف سماجی حقیقتوں کی صحیح سمجھ اور ان حقیقتوں کا پر اثر اظہار ہے۔یہ حقیقتیں اپنے زمان و مکاں کے اعتبار

سے پیش کی جانی چاہیے اور زمان و مکان کا یہی شعور کافی حد تک تخلیقات میں تاریخی شعور کا تعین کرتا ہے۔ (۲)

تاریخ فرخ سہیل گوئندی کا پسندیدہ مضمون ہے۔ وہ تاریخ سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں وہ مختلف ممالک کے سفر کے دوران جہاں اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں وہیں ساتھ ساتھ اس ملک کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کا ذکر تفصیلی کرتے ہیں۔میں ہوں جہاں گرد تین ممالک کے سفر پر مشتمل سفر نامہ ہے جس میں فرخ صاحب نے ان تین ممالک کے سفر کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تاریخ کی کو بھی بیان کیا ہے۔ ان ممالک کی تاریخ کے بیان کرنے سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ان کے سفر نامے میں ایرانی تاریخ کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ تاریخ کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں اور قاری بڑی دلچسپی کے ساتھ سفر نامے کو پڑھتا جاتا ہے۔

ایران میں انقلاب سے قبل محمد رضا شاہ کی حکومت تھی۔ ۱۹۷۷ء میں شہنشاہ ایران کے خلاف عوامی تحریک پروان چڑھی اور اس تحریک کو ختم کرنے کی بہت زیادہ کوششیں کی گئی لیکن یہ تحریک دب نہ سکی اس تحریک میں ایران کے مذہبی، اشتراکی اور ترقی پسند غرض ہر مکتب فکر کے لوگوں نے حصہ لیا۔ بالآخر اس تحریک کی بدولت ۱۹۷۷ء میں انقلاب برپا ہوا اور اس اسلامی انقلاب کی نمائندگی آیت اللہ خمینی کر رہے تھے۔

انقلاب ایران کی وضاحت فرخ صاحب نے اپنے سفر نامے میں تفصیل سے کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> اکتوبر ۱۹۷۷ء میں شہنشاہِ ایران کے خلاف عوامی تحریک نے جنم لیا۔۔۔۔ اگست ۱۹۷۸ء سے دسمبر ۱۹۷۸ء تک کے عرصہ میں عوامی تحریک انقلابی رنگ اختیار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس عرصے میں شہنشاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کا تخت و تاج جھلنے لگا اور پورے ملک میں ایران کا پرچم لہرانے لگا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی ملک سے نکلنے پر مجبور ہوا۔ ایران کے ہر شہر، قصبے اور دیہات میں گلی گلی مرگ بر امریکہ، مرگ بر شاہ کے نعرے بلند تھے۔ یکم فروری ۱۹۷۹ء کو آیت اللہ روح اللہ خمینی اپنی چودہ سالہ جلاوطنی ختم کر کے ائیر فرانس کی ایک خصوصی پرواز ۴۷۲۱ کے ذریعے ۱۲۰ سے زائد عالمی صحافیوں کے ہمراہ واپس سرزمین وطن ایران لوٹے۔ (۳)

شاہ عباس اعظم صفوی سلطنت کا عظیم بادشاہ تھا اس کی پیدائش ۱۷ جنوری ۱۵۷۱ء کو ہوئی اور اس نے ۱۹ جنوری ۱۶۲۹ء کو وفات پائی۔ اس کے دور کو صفویہ خاندان کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ سترہ سال کی عمر میں تخت نشینی سنبھالی۔ اس کے دور حکومت میں ایران کے شمال مغربی حصے پر سلطنت عثمانیہ کا قبضہ تھا اور مشرق میں خراساں ازبک قابض تھے۔ شاہ عباس جب تخت نشین ہوا تو ایران پر غیر قابض تھے، اس نے بڑے تدبر اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے ساری صورتحال کو سنبھالا اور ترک عثمانیوں اور ازبکوں کو ایران سے باہر نکال دیا۔ شاہ عباس نے اپنے دور

حکومت میں ایران کو غیروں سے چھڑانے کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سے اصلاحات کیں مثلاً انھوں نے علم وادب کے شعبے میں کام کیا اور نئے شہروں اور بستیوں کی بنیاد بھی رکھی۔ اس کے دور میں فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے شعبے نے بہت ترقی کی۔ اس کے دور ہی میں اصفہان جو ایران کے وسط میں واقع ہے اس کو دارالحکومت بنایا گیا اور اسے اتنی ترقی دی گئی کہ اس شہر کو ''اصفہان نصف جہان'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

فرخ سہیل نے شاہ عباس کے کارناموں کو سفر نامہ میں اس طرح بیان کیا:

> اصفہان ۱۷۲۲ء۔۱۵۹۸ء تک ایران کا دارالحکومت رہا۔ اس شہر کو شاہ عباس اعظم نے ایرانی سلطنت کو دارلحکومت بنا کر چار چاند لگا دیئے۔ اس دور میں ایران اندرونی اور بیرونی طور پر خلفشار کا شکار تھا۔ ایران کے بڑے علاقے شہنشاہوں اور ازبکوں کے زیر آ چکے تھے، اس نے ان خطوں کو منظم جنگوں کے ذریعے واپس لیا۔ اس نے وسطی ایران میں ایران کا محفوظ دارالخلافہ بنایا ہی اس کے ساتھ علم وادب، فن اور شاندار ایرانی تعمیرات کا گہوارہ اور نمونہ بناڈالا جو آج تک قائم ہے۔ [۴]

اصفہان میں واقع قدیم آرمینیائی بستی جلفانو جس کو شاہ عباس نے آباد کیا اس کا تعارف اس طرح کرواتے ہیں:

> یہ آرمینیائی بستی ۱۶۰۶ء میں ایرانی شاہ عباس اعظم نے آباد کی۔ آرمینیوں کے عثمانیوں کے ساتھ تصادم سے فائدہ اٹھاتے، شاہ عباس اعظم نے اپنی حکمرانی کا کمال دکھاتے ہوئے انھیں یہاں آباد کیا۔ آرمینی تجارت خصوصاً ریشم کی تجارت سے وابستہ تھے اور ان کی یورپی دنیا سے مشرقِ بعید تک تجارتی رابطے تھے۔ کہتے ہیں کہ شاہ عباس اعظم کے دور میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد آرمینی اصفہان میں بسائے گئے۔ ان آرمینیوں نے ایران کو اس وقت عالمی تجارت میں اہم مقام دلوادیا۔ [۵]

آرمینیائی شہر کی تاریخ کے حوالے فرخ سہیل مزید لکھتے ہیں:

> شاہ عباس اعظم نے ۱۶۰۶ء میں ''جلفانو'' کی آرمینیائی بستی کی بنیاد رکھی۔ اسے آرمینیائی Nakhchivan بھی کہتے ہیں۔ جلفا، آرمینیا کے ایک قدیم علاقے کا نام تھا، یہ بستی اسی مناسبت سے جلفانوی کہلائی، وہ خطہ اب آذربائیجان میں ہے۔ Nakhchivan کوہ قاف میں آج کل آذربائیجان میں ایک خود مختار ریپبلک ہے یہ پہلے آرمینیائی خطہ تھا۔ زمانے کے تغیرات اور جبر سے یہ آرمینیائی سے آذربائیجانی خطہ Nakhchivan بن گیا۔ جلفانو میں آباد لوگوں کی اکثریت Nakhachivani لوگوں کی تھی جن میں مسیحی، مسلمان اور آرمینی یہودی بھی شامل تھے جو اس بستی میں لا آباد کیے گئے۔ آج بھی آرمینیوں کے نزدیک Nakhachivan ایک مقدس نام ہے۔ آرمینی مسیحیوں کے مطابق حضرت نوحؑ نے Nakhachivan کو آباد کیا۔ ان کے نزدیک یہ Biblican خطہ ہے۔ [۶]

رے شہر ایران کا قدیم تاریخی شہر ہے ،اس کو فیروزان یزد گرد نے آباد کیا۔ اس شہر میں شہر بانو اور شاہ عبدالعظیم کے علاوہ کئی عظیم پاکیزہ ہستیاں مدفن ہیں۔اس کی تاریخ پانچ ہزار سال سے قدیم بیان کی جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں اس شہر کا نام ''رے'' تھا۔ یہ شہر تہران کے ساتھ واقع تھا لیکن اب اس کی آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے یہ تہران کا حصہ بن گیا ہے۔اس شہر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرخ سہیل گوئندی لکھتے ہیں۔

رے شہر ایران کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے ۔ قبل ازیں اسے راگا بھی کہا جاتا تھا۔ آرکیالوجی کے مطابق چھ ہزار سال پرانی ہے ۔اس علاقے میں پہلے ٹیلوں کی کھدائی سے پرانی تہذیبوں کے لاتعداد آثار ملے ہیں۔ جب سکندر اعظم نے ایران فتح کیا تو اس کے جرنیل سیلوکس نے اس کا نام بدل کر مقدونیہ رکھ دیا۔ یہاں پر موجود تین ہزار سالہ قدیم قلعہ اپنے کھنڈرات کے باعث اس بستی کی قدامت کا منہ بولتا ثبوت ہے سلجوقیوں کے عہد میں یہ شہر گیارھویں سے تیرھویں صدی تک ان کا دار لحکومت رہا اور پھر منگولوں نے اس شہر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔(۷)

کرو، کردستان سے تعلق رکھنے والے باشندے کہلاتے ہیں۔ان لوگوں کی زیادہ تر بستیاں ایران، ترکی، عراق اور شام میں ہیں۔ یہ قوم تین سو سال قبل از مسیح سے ایران سے شام تک پھیلی ہوئی ہے۔ ساتویں صدی میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا۔ کرد خانہ بدوشوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو مشرق وسطیٰ میں کئی نئی آزاد ریاستیں وجود میں آئیں لیکن کرد آزاد مملکت حاصل کرنے سے محروم رہے۔ ۱۹۲۰ء کے سیورے معاہدہ کے تحت عراق، شام اور کویت کی مملکتیں آزاد ہوئیں اور تب کردوں سے آزاد ریاست کا عہد بھی کیا گیا لیکن مصطفیٰ کمال پاشا کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ترکی کے ساتھ ساتھ ایران اور عراق کی حکومتوں نے بھی کردوں کی آزاد ریاست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کردوں کی آبادی کا سب سے زیادہ تناسب ترکی میں ہے یہاں ان کی آبادی ایک کروڑ اسی لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں کرد عوام نے شیخ سعید کی قیادت میں بغاوت کی جس کے سبب ترک حکومت نے کردوں کے خلاف سخت پالیسی اپناتے ہوئے ان کی زبان و ثقافت کو ختم کرکے پہاڑی ترک قرار دے کر انھیں ترک قوم میں ضم کرنے کی کوششیں شروع کر دی۔ ۱۹۷۸ء میں ترکی کے کردوں نے دوبارہ آزادی کی تحریک شروع کی جس کی وجہ سے ترک حکومت اور کردوں میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی اور اس تحریک کی بدولت ترک حکومت کی معیشت کو دھچکا لگا اور تقریباً ۴۵۰ ارب ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں کردوں کی تحریک کا تفصیلی احوال بیان کیا گیا، فرخ صاحب لکھتے ہیں۔

ترکی، ایران، عراق اور شام کی سرحدات کے درمیان دجلہ کے میٹھے پانیوں سے شروع ہو کر عراق کے تیل تک، کرد جہاں بھی موقع ملے اپنی علیحدگی کی تحریک کا سر اٹھاتے رہتے ہیں۔ وقت اور حالات کے مطابق یہ چاروں ممالک کسی نہ کسی ایک کرد تحریک کی پشت پناہی بھی کرتے ہیں ۔۔۔۔امریکہ، سوویت یونین اور اب روس اپنے علاقائی مفادات کے لیے کسی نہ کسی علیحدگی پسند کرد تحریک کی پشت پر رہتے ہیں۔ ایران کے اکتیس صوبوں میں ایک کردستان کے نام سے موجود ہے۔ ترکی میں رہنے والے کرد ان چار ممالک میں بسنے والے کردوں کا ۴۸ فیصد اور ترکی کے اندر کردوں کی آبادی کا تناسب ۲۰ سے ۲۵ فیصد تک ہے۔ بدبخت کردوں کے پاس خطے کے ان چار علاقائی طاقتوں اور عالمی طاقتوں کا مہرہ بننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب روس میں بالشویک انقلاب آیا تو انھوں نے Red Kurdastan کے نام پر سوویت آذر بائیجان کے اندر کردوں کی ایک خود مختار ریاست قائم کی۔ پھر دوسری جنگ عظیم میں جب اتحادی افواج پر چڑھائی کی تو سوویت یونین نے قدیم کرد ریاست کے نام پر Republic of Mahabad کے نام سے ایران کے زیر قبضہ حصے پر کرد ریاست قائم کر دی جو ۲۲ جنوری ۱۹۴۶ء سے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۶ء تک قائم رہی۔۔۔۔ترکی میں تیسرا مارشل لاء لگا اس دوران انقرہ کی طلبا سیاست میں قدم نکالنے والے عبداللہ اوجلان نے ترکی کے اندر کردوں کی علیحدگی کی تحریک کو تیز کر دیا۔ اس کرد تحریک کو شام لبنان کے اندر مسلح تربیت دی اور سوویت یونین اس کرد تحریک کا اہم سرپرست تھا۔(۸)

ارض روم کا قدیم نام کیرن تھا پھر بازنطینی عہد میں یہ شہر تھیوڈوپولس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کا موجودہ نام جنگ ملاز کرد میں فتح کے بعد مسلمانوں نے دیا۔ یہ شہر مختلف ادوار میں مختلف جنگوں کا شکار بنتا رہا اور مختلف قومیں اس پر قبضہ کرتی رہیں۔ ۱۸۲۹ء میں اس شہر پر روس نے قبضہ کیا لیکن معاہدہ ادرنہ (Treaty of Araịnople) کے تحت یہ شہر دوبارہ عثمانیوں کے قبضے میں آگیا۔ ۱۸۷۷ء میں روس نے ایک بار پھر اس شہر پر حملہ کیا اور دوران شہریوں نے اس حملے کے خلاف مزاحمت کی لیکن روسی افواج اس اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں تاہم معاہدہ سان اسٹیفنو کے تحت دوبارہ سلطنت عثمانیہ کو مل گیا۔ ۱۹۱۵ء میں یہ شہر آرمینیائی باشندوں کے قتل عام اور ان پر مظالم کے لیے اہم مرکز رہا۔ ۱۹۱۶ء میں یہ شہر تیسری مرتبہ پھر روسی افواج کے قبضے میں آگیا اور ۱۹۱۸ء میں معاہدہ بریسٹ۔لیٹوفسک کے تحت پھر سلطنت عثمانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں ارض روم کانگریس جو ترک جنگ آزادی کا آغاز سمجھی جاتی ہے۔ ترک جنگ آزادی ایک تحریک تھی جو پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد ترک قوم نے شروع کی اس کی ابتدا ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء میں ہوئی اور اختتام ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو ہوا۔ فرخ

سہیل گوئندی صاحب نے اس شہر کی تاریخ کو مشاہدے کے ساتھ اپنے سفر نامے میں ہوں جہاں گرد میں بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

وہ ترکی کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ارض روم میں ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء سے ۱۴ اگست ۱۹۱۹ء یعنی تیرہ دن ۵۶ بہادر ترک سپوت اکٹھے ہو کر اپنی قوم کے متعلق فیصلہ نہ کرتے تو ترکی آج کچھ یونان، کچھ شام، عراق، بلغاریہ، روس، آرمینیا اور نہ جانے کس کس حصے میں بٹا ہوتا۔ آیا صوفیہ اور نیلی مسجد آج یونانی گرجا ہوتے۔ اور ہم سیاح لوگ قرطبہ کی مشہور زمانہ ہسپانوی مسجد کی طرح، نیلی مسجد استنبول کے سامنے تصویر بناتے کہ کبھی یہ مسجد بھی آباد ہوا کرتی تھی۔ استنبول کے لیے یونان کا ویزا لیتے اور ارض روم کے لیے روس یا آرمینیا کا ویزا درکار ہوتا۔۔۔ ارض روم کانگریس ۲۳ جولائی ۱۹۱۴ء تا ۱۴ اگست ۱۹۱۹۴ منعقد ہوئی جس نے ترکوں کو ایک نئے جنم کے فیصلے پر اکٹھا کیا۔(۹)

علاؤالدین کیقباد بن کیکاوس سلجوق سلطنت کا حکمران تھا۔ اس کا دور حکومت ۱۲۲۰ء سے ۱۲۳۷ء کے عرصہ پر محیط ہے۔ یہ سلجوقیہ سلطنت کا آخری بااثر حکمران تھا۔ اس کے دور میں بہت سے اہم معرکے سر کیے گئے ، عثمانیہ سلطنت کے بانی ارطغرل غازی نے اسی کے عہد میں باز نطین کے بہت سے علاقوں پر فتح حاصل کی اور کئی قلعوں پر سلجوق سلطنت کے پرچم لہرائے۔ علاؤالدین کے دور میں بہت سے تعمیراتی کام بھی کیے گئے ان میں اناطولیہ میں پہلی مسجد کی تعمیر کی گئی جو آج بھی اناطولیہ میں واقع ہے اس کی تاریخ پر فرخ سہیل یوں نظر ڈالتے ہیں۔

> سلطان علاؤالدین جامع۔ معروف سلجوقی سلطان علاؤالدین کیقباد (۱۲۳۷ء-۱۲۲۰ء) کے نام سے اس قدیم ترین مسجد کی تعمیر ۱۲۲۰ء میں سلطان عزیزالدین کیکاؤس اول نے کروائی۔ میں نے اس حوالے سے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ سلطان علاؤالدین جامع در حقیقت ۱۱۷۸ء میں ایک چھوٹی سی مسجد کے نام پر تعمیر ہو گئی تھی، مگر تکمیل علاؤالدین کیقباد کے دور میں ہوئی۔ مسجد کے اندر لکڑی کا خاصا کام ہوا ہے اس کا باہر والا حصہ منہدم ہو چکا ہے عثمانی دور میں اس میں توسیع ہوئی۔ بنیادی طور پر علاؤالدین جامع، سلجوقی فن تعمیر کا ایک اولین شہ پارہ ہے۔ لکڑی کا منبر جو سلجوقی دور میں بنا ابھی تک زیر استعمال ہے۔ لکڑی کے منبر کے علاوہ بھی مسجد میں لکڑی پر کندہ کری ابھی تک برقرار ہے۔ ۱۹۵۴ء میں علاؤالدین جامع کو ترک حکومت نے خصوصی توجہ دے کر مرمت کروایا۔(۱۰)

مصطفیٰ کمال پاشا، جنگ عظیم اول میں عثمانی فوج کے سالار اور جدید ترکی کے بانی اور پہلے صدر تھے۔ خلیفہ عبدالحمید کے دور حکومت میں ان کے خلاف مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے کچھ عرصہ قید رہے اور رہائی

کے بعد فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ جنگ اطالیہ اور جنگ بلقان میں اپنی خدامت سرانجام دیں۔ پہلی جنگ عظیم میں صوفیہ میں اپنی فوجی خدمات سرانجام دے رہا تھا تب اس نے جنگ میں حصہ لیا۔

> جنگ سقاریہ ۲۳ اگست ۱۹۲۱ء سے ۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء تک اکیس دنوں میں ترکوں نے جنگ میں جو فتح حاصل کی، وہ ترکوں کی آزادی کا امید تھا۔ یونانی اس سارے خطے میں بشمول استنبول پر جہاں ان کی سب سے بڑی آیا صوفیہ تھی، اپنی قدیم یونانی سلطنت کی بحالی کا دعویٰ کر کے استنبول کے گرداگرد دھاوا بول چکے تھے۔ اس موقع پر ترکوں کے سپہ سالار مصطفیٰ کمال پاشا نے کہا، ''ہمارے پاس دشمن کے خلاف لڑنے کا کوئی چارہ نہیں، سوائے اس کے کہ وہ ہمیں نیست و نابود کر دیں اور ہم بحیرہ مارمرا میں ڈوب مریں یا ہم انھیں شکست فاش سے دوچار کر کے ان کے گھناؤنے خواب کو بحیرۂ مارمرا میں ڈبو دیں۔ (۱۱)

ترکی زبان کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ عثمانیوں کے دور حکومت میں فارسی اور عربی زبان کو بہت زیادہ فوقیت دی جاتی تھی اور ترکی زبان کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس دور میں جو ترک زبان بولتے تھے انھیں جاہل سمجھا جاتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے دور حکومت میں ترکی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا جاتا اور اس زبان کو عثمانی ترکی زبان کہا جاتا۔ ۱۹۲۳ء میں جب جدید ترکی کا قیام عمل میں آیا تو ترک قوم نے اپنی زبان کی حفاظت کے لیے اپنی زبان کے حق میں اپنی آواز بلند کی اور ۱۹۲۸ء میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کی کوششوں سے ترکی زبان میں اصلاحات کی گئیں اور عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط کو رائج کیا گیا اور عثمانی حروف تہجی کو بدل کر ترکی حروف تہجی میں تبدیل کر دیا گیا۔ فرخ سہیل گوئندی سفر نامہ میں لکھتے ہیں۔

> ترک قوم کی شناخت میں ان فکری تحریکوں کا اہم ترین نکتہ اپنی ترکی زبان کی بحالی تھا۔ عثمانی اشرافیہ کی زبان بری طرح Persiaanate (فارسی اثر کے تحت) ہو چکی تھی۔ اس عثمانی اشرافیہ کی زبان ''عثمانلی'' کو برتری حاصل تھی اور ترک زبان کا جاہل اور اناطولیہ کے گنواروں کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ اتاترک کی پیدائش سے دہایوں قبل ترک زبان کی بحالی کی تحریک، ترک دانشوروں کی قوم پرستی کا ایک اہم نکتہ تھا۔ جب ترکی میں زبان کی اصلاحات کی گئیں تو اس وقت '' عثمانلی''یعنی عثمانی ترک زبان میں ۸۸ فیصد فارسی اور عربی کے الفاظ شامل ہو چکے تھے ۔۔۔۔۱۹۲۶ء میں جب سابق سوویت یونین میں شامل ترک اقوام نے باکو کانگریس میں لاطینی حروف تہجی اختیار کر لیے تو اب اتاترک کے پاس سیاسی جواز تھا کہ ترکوں کو ایک ربط میں باہم پیوست کیا جائے۔ وہ ''گنوار، جاہل اور اجڈ ترکوں'' کو عربی اور فارسی کی بالادستی سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔ وہ ترک قوم کو اس کی ہزاروں سال پرانی زبان سے جوڑنا چاہتے تھے جو وسطی ایشیا، منگولیا اور چینی ترکستان میں اپنا قدیمی رسم الخط ہی رکھتی اور جو اب مکمل طور پر فارسی اور عربی میں

گم ہو چکی تھی۔ وہ اسے ترک قوم کی شناخت اور ترقی کا سنگ میل بنانا چاہتے تھے اور یوں نومبر ۱۹۲۸ء میں ترکی کی اسمبلی نے رسم الخط کا نیا قانون منظور کیا اور ترک زبان کی تلاش کا سفر شروع کیا۔ (۱۲)

گرینڈ نیشنل اسمبلی ۱۹۲۰ء میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے قائم کی۔ گرینڈ نیشنل اسمبلی کی تشکیل کو حکومتی نظام کا سب سے اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ یہ اسمبلی ترکی کی سیاسی و ثقافتی اداروں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں اس کے لیے تحریک چلی اور انقرہ شہر میں اس کو تشکیل دینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں پورے ملک کے مختلف علاقوں اور جماعتوں کے نمائندوں نے اس میں شرکت کی۔ اس اسمبلی کا مقصد ترکی کی سیاسی وحدت کو مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ ترکی کے آئین اور قومی استقلال کے لیے ایک حکومتی نظام کو تشکیل دینا تھا۔ گرینڈ نیشنل نے ۱۹۲۳ء میں ترکی کے آئین کی تصدیق کی اور اس کے بعد سلطان محمد کی سلطنت کا خاتمہ کر کے کر کے اتاترک کی حکومت کو تشکیل دیا۔ اس کے بعد ترکی میں جمہوری نظام قائم کیا گیا اور اتاترک کی حکومت کا آغاز ہوا۔ مصنف نے سیاحت کے دوران گرینڈ نیشنل اسمبلی کا دورہ کیا اور اس کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو اتاترک نے یہاں گرینڈ نیشنل اسمبلی قائم کی۔ انگورہ یوں فوجی مزاحمت اور جنگ آزادی اور نئی شناخت کی امید بنا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مکمل کے بعد انگورہ کو ترکیہ جمہوریہ کا دار لحکومت قرار دیا۔ زوال کی راکھ سے نئی مملکت کا قیام۔ قدیم یونان میں اسے Anchor بھی کہا جاتا رہا ہے۔ جی وہی جس سے بحری جہاز سفر کے بعد لنگر انداز ہوتا ہے۔ یہ ایک ہی لفظ ہے۔ انقرہ اس نئی مملکت کا Anchor (لنگر) بنا۔ بیڑا پار ہونے کے بعد مملکت جمہوریہ ترکیہ یہاں لنگر انداز ہوئی جسے یورپ کے ترقی یافتہ ممالک ''یورپ کا مردِ بیمار'' کہتے تھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے اس مردِ بیمار کو ایک نئی زندگی ہی عطا نہیں کی بلکہ توانا، کامیاب اور طویل زندگی عطا کر دی۔ (۱۳)

آیا صوفیہ کا شمار ترکی کی قدیم اور شاہکار تعمیرات میں ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر تقریباً پانچویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہوئی۔ ترکی میں مختلف ادوار مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے حکومت کرتے رہے۔ اسی وجہ سے آیا صوفیہ کی حیثیت بھی اسی مناسبت سے اہمیت کی حامل رہی۔ اس عمارت کا استعمال کبھی مسجد کے طور پر کیا گیا تو کبھی کلیسا بنا دیا گیا۔ فرخ سہیل نے دوران سفر جن مقامات کی سیر کی وہاں کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان مقامات کی مکمل تاریخ بھی بیان کی ہے۔

آیا صوفیہ کی تاریخ کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنے سفر نامے کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

آیا صوفیہ کے عالمی شہرت یافتہ کیتھڈرل کی تعمیر کا آغاز ۵۳۲ء میں ہوا جس کی تکمیل پانچ سال میں ۵۳۷ء میں ہوئی۔ کانسٹنٹائن اعظم نے جب قسطنطیہ کو مشرقی رومن ایمپائر کا دار لحکومت قرار

دیاتو یہی شہر مشرقی آرتھوڈوکس مسیحت کا مرکز بنا۔ قسطنطنیہ، مشرقی آرتھوڈوکس (یونانی آرتھوڈوکس) چرچ کی سیٹ قرار دے دیا گیا جسے Ecumenical Patriarchate of Constantinople کہا جاتا ہے۔ نیوروم Nova Romaکا کیتھڈرل جو ۳۳۰ء میں کانسٹنٹائن اعظم نے یہاں منتقل کیا تھا۔

یونانی اور رومن زبان میں ہاگیا صوفیہ، لاطینی میں سانتا صوفیہ یعنی "مقدس تدبر" بازنطینی بادشاہ جسٹینین اعظم کے حکم سے تعمیر ہوا۔ بازنطینی بادشاہ نے اپنے وقت کے دو عظیم معماروں Isodore of Miletusاور Anthemius of Trallesکو حکم دیا کہ مجھے مشرقی روم ایمپائر کا عظیم الشان کیتھڈرل بنانا ہے جس کا گنبد ہمارے مذہب، ہماری سلطنت اور قسطنطیہ کی عظمت اشہرہ آفاق ثبوت بنے۔۔۔ڈیڑھ ہزار سال قبل تعمیر ہونے والا آیا صوفیہ کے گنبد اور اس کی عمارت کا جلال اس کے اندر کھڑے ہو کر آج بھی محسوس ہو رہا تھا۔ (۱۴)

سلطنت عثمانیہ کا دور حکومت ۱۵۱۷ء سے لے کر ۱۹۲۴ء کے عرصے پر محیط ہے۔ سلطنت عثمانیہ تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے پہلے فرمانروا عثمان خان کا خاندان ایشیائے کوچک میں خانہ بدوش کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ انھوں نے سلجوقی سلطنت کی بنیاد رکھتے ہوئے مشرق وسطیٰ، افریقہ اور اناطولیہ پر حکومت کی، اس کے بعد عثمان خان نے سلطنت عثمانیہ کی بنیاد رکھی جو آٹھ سو سال تک قائم رہی۔ عثمانی حکومت نے رومیوں اور بازنطینوں کو شکست دے کر نئی ترک تہذیب کی بنیاد رکھی۔ عثمانیوں نے تین براعظموں پر اپنا پرچم بلند کیا۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فرخ سہیل گوئندی صاحب کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ترکی کے ذکر کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کا تعارف لازم ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی اپنے سفر نامے میں عثمانی سلطنت کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

۲۳ مارچ ۱۴۵۳ء کو عثمانی دارالحکومت ایدرنے سے ساتویں سلطان محمد دوئم نے اپنی جنگی مہم کا آغاز شاہی توپ خانے کی روانگی کی تقریب سے کیا اسّی ہزار عثمانی فوج جس میں پہلی مرتبہ کسی ریاست نے منظم انفینٹری کو متعارف کروایا، جو کہ مسیحوں پر مشتمل تھی، اس کے بعد نوجوان پیادوں کی فوج جو عرب عارضی سپاہیوں پر مشتمل تھی، جسے عثمانی "عزب" کہتے تھے۔ یہ کنوارے عرب (رنگروٹ) نوجوان دیہات سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ (۱۵)

سٹالن گراڈ جس کا موجودہ نام وولگو گراد ہے اس شہر میں ایک عظیم معرکہ ہوا جو معرکہ سٹالن گراد کے نام سے جانا جاتا ہے اسے جنگ عظیم دوم کا سب سے اہم موڑ سمجھا جاتا ہے جس میں تاریخ کی سب سے زیادہ انسانی جانوں کا نقصان ہوا۔ اس معرکے میں نازی جرمنی نے اس شہر کا معاصرہ کیا اور سوویت اتحاد نے جوابی حملہ کیا جس کے نتیجے میں

تقریباً ۲۰ لاکھ ہلاکتیں ہوئیں، اس کے علاوہ مالی نقصان بھی دونوں کو برداشت کرنا پڑا۔ اس جنگ میں سوویت اتحاد کو فتح نصیب ہوئی۔ فرخ سہیل صاحب لکھتے ہیں کہ جب وہ کسی مقام کی سیر کرتے ہیں تو اس شہر کی پوری تاریخ ان کے ذہن میں گھوم جاتی ہے اور جب لکھنا شروع کرتے ہیں تو روانی کے ساتھ لکھتے ہی جاتے ہیں۔

سٹالن گراڈ شہر کی تاریخ پر یوں نظر ڈالتے ہیں:

> بلقان ایکسپریس جب سولن گراڈ رکی تو "گراڈ" لفظ نے میرے دماغ میں موجود معلومات اور خیالات میں مزید اودھم مچاوی۔ سوویت یونین کے اس شہر کا نام ایسا ہی ہے، "سٹالن گراڈ" جہاں ہٹلر کے فاشزم کے خلاف دوسری جنگ عظیم میں سٹالن کی سوویت افواج نے جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر حتمی جنگ لڑی۔ "Battle of Stanlingrad"۔ ۲۳ اگست ۱۹۴۲ء سے ۲ فروری ۱۹۴۳ء تک سٹالن گراڈ کا شہر دوسری عالمی جنگ کا فیصلہ کن میدان جنگ بن گیا۔ اس کی گلیوں، محلوں، چوکوں، بازاروں، مضافات میں اشتراکی روس کی افواج نے جرمن افواج کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ یہی وہ شہر تھا جس نے عالمی جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔ کہتے ہیں کہ یہاں جنگ House to House ہوئی یعنی ہر گھر میدان جنگ تھا۔ "جنگ سٹالن گراڈ" میں بیس لاکھ لوگ جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یہیں سے جرمنی کی پسپائی کا آغاز ہوا۔
>
> "سٹالن گراڈ" کا اس جنگ سے پہلے نام والگو گراڈ تھا۔ اس جنگ میں سوویت یونین کی فتح کے بعد ہی اس کا نام "سٹالن گراڈ" رکھا گیا۔ جب سویت یونین میں سٹالن کا دور ختم ہوا تو نکتیا خروشیف کے دور میں ۱۹۶۱ء میں دوبارہ اس کا پرانا نام والگو گراڈ بحال کر دیا گیا۔ (۱۶)

بلغاریہ کا سرکاری نام جمہوریہ بلغاریہ ہے یہ جنوب مشرقی یورپ میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں پانچ ممالک سے ملتی ہیں شمال میں دریائے ڈینیوب کے ساتھ رومانیہ، مغرب میں سربیا اور مقدونیہ، جنوب میں ترکی اور یونان واقع ہیں۔ بلغاریہ کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ بلغاریہ قوم کی تاریخ پر فرخ سہیل نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> بلغار قوم کا اصل یا اوریجن کے بارے میں مختلف آرا ہیں بلغار قوم کو انگریزی میں Bulgarian کہا جاتا ہے۔ اردو میں بلغار، جبکہ خود ان کی اپنی زبان میں "بلگار"۔ زیادہ تر مؤرخین اور ماہرین بشریات کی تحقیق ہے کہ وسطی ایشیا کے خانہ بدوش ہیں۔ تقریباً دو ہزار سال پہلے بلقان میں آکر آباد ہوئے جہاں رومنوں کے تحت دیگر قومیں آباد تھیں اور یہاں انھوں نے تھریس، قدیم یونانی، بازنطینی تہذیب و تمدن کے ملے جلے اثرات اندر جذب کیے۔ تھریس کی سرزمین اور بلقان میں بلغار قوم کی نسلیاتی تشکیل ہوئی۔ تہذیبی ارتقا کے صدیوں کے اس عمل میں وہ جنوبی سلاوی قوموں میں ایک نمایاں قوم کے طور پر ابھری۔ جن میں بوسینیائی، کرشیائی، مقدونی، مونٹی، نیگرویائی، سربیائی اور سلووینائی قومیں شامل ہیں۔ جنوبی سلاوی قوموں کے تصور

سے ہی یوگوسلاویہ کی فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ مگر بلغار قوم جنوبی سلاوی وفاق (یوگوسلاویہ)
میں شامل نہیں ہوئی۔ بلغاروں کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے اور اپنے تاریخی فخر کے حوالے سے ان
کا یورپ کی تاریخ میں اہم مقام ہے۔ بلغار اپنے "ہن" ہونے پر فخر کرتے ہیں جن کا ثبوت ان کی
اولین تاریخی دستاویزات سے ملتا ہے۔۔۔(۱۷)

بلغاریہ سلطنت کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ قدیم بلغاریہ سلطنت جو ۶۳۲ء میں قیام پذیر ہوئی۔ ۶۸۰ء میں بازنطینی بادشاہ کونسٹنٹن چہارم پوگونات نے قدیم بلغاریہ پر حملے کیے لیکن بلغاریہ کے باشندوں نے بازنطینوں کو شکست دی اور پھر ایک امن معاہدہ پر دستخط ہوئے اور بلغاریہ کو بازنطینیوں نے تسلیم کر لیا۔ دوسری بلغاریہ سلطنت ۱۱۸۵ء میں سامنے آئی اور چودھویں صدی کے آخر تک یورپی تاریخ میں اس کا اہم مقام رہا۔ انیسویں صدی کے شروع میں بلغاریہ میں لبرل ازم اور قوم پرستی کے نظریات پروان چڑھے، ۱۸۲۱ء میں یونان نے عثمانیہ سلطنت کے خلاف بغاوت کی جس سے بلغاریائی قوم بھی متاثر ہوئی اور اپنے حقوق اور ریاست کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ۱۸۷۹ میں بلغاریہ کا پہلا جمہوری آئین بنا۔ ۱۸۸۵ء میں مشروقی رومیلیا اور حکومتِ بلغاریہ کا آپس میں اتحاد ہوا۔ اور ۱۹۰۸ء میں شہزادہ الیگزینڈر کے جانشین فرڈینینڈ نے باضابطہ طور پر بلغاریہ کی آزادی حاصل کی۔ میں ہوں جہاں گرد میں بلغاریہ کی تاریخ بڑے مؤثر انداز میں کیا گیا ہے فرخ سہیل نے بلغاریہ کی تاریخ کو تفصیلی بیان کیا ہے ان کے سفر نامے سے بلغاریہ کی تاریخ کا ایک اقتباس درج ہے۔

دوسری بلغار سلطنت ۱۱۸۵ء میں ابھری اور ۱۳۹۶ء تک اس کا یورپی تاریخ میں ایک خاص مقام
قائم رہا۔ اس سلطنت کا دارالحکومت بلغاریہ کا ایک چھوٹا سا مگر نہایت خوبصورت شہر "ویلکیوٹرنو"
VelkioTarnovo تھا۔ بعد ازاں بلغاریہ پانچ صدیوں تک عثمانی سلطنت کا حصہ
رہا۔ موجودہ بلغاریہ کی مختلف عثمانی ولائتیں (صوبے) تھیں۔ عثمانی اپنی سلطنت میں رہنے والے
تمام مذاہب کے لوگوں کو "ملت" قرار دیتے تھے۔(۱۸)

تاریخ کی اقسام میں ایک قسم سوانحی تاریخ کی ہے۔ سوانحی تاریخ میں کسی شخصیت کا تفصیلی احوال بیان کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ میں سوانحی تاریخ کے نمونے ملتے ہیں۔ ایوان ویزوف بلغاریہ کا قومی ادیب ہے، ان کے نام پر بلغاریہ میں پارکس بھی بنائے گئے۔

ایوان ویزوف کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

ایوان ویزوف شاعر، ادیب، ناول نگار، ڈرامہ نگار اور لکھاری تھے۔ وہ آزادی کا پروانہ کہلاتا تھا۔
اسے بلغاری ادب کا باپ بھی کہا جاتا ہے۔ ۱۸۹۷ء سے ۱۸۹۹ء تک وہ بلغاریہ کا تعلیم و روشن خیالی کا

وزیر بھی رہا۔ وہ بلغاریہ کی پیپلز پارٹی کا رکن تھا۔ ۱۹۱۷ء میں اسے نوبل انعام کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔[۱۹]

تاریخ ماضی کے واقعات پر مشتمل ہے جبکہ ادب میں ماضی کے واقعات کو فطرت کے مطابق فنکارانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ میں جہاں گرد کا مطالعہ کے دوران یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فرخ صاحب نے بڑی مہارت کے ساتھ ادب تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کو بیان کیا ہے۔ ان کے سفر نامے میں ہمیں تاریخ کی مختلف اقسام جیسے، جنگی تاریخ، سوانحی تاریخ اور مذہبی تاریخ وغیرہ کی صورتیں ملتی ہیں۔ انھوں نے جن ممالک کی سیر کی ان ممالک کی تاریخ اور وہاں موجود قدیم عمارتوں کی تاریخ بیان کی ہے۔

سیاسی عناصر:

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں سیاسی عناصر کا جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ سیاست کیا ہے؟ ادب اور سیاست کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اور اس کی کیا اہمیت ہے؟ سیاست کا مفہوم عام طور پر نظام حکومت کو چلانے کا فن سمجھا جاتا ہے۔ سیاست عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ بطور اسم مونث مستعمل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی کسی ملک کا نظام حکومت، ملکی تدبیر و انتظام، طریقہ حکمرانی وغیرہ لیے جاتے ہیں۔

قومی انگریزی لغت میں سیاست کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

> سیاست سے مراد حکومت کاری کا علم، کسی حکومت، قوم یا کسی مملکت کی حکمت عملیاں اور مقاصد، سیاسی جماعتوں کے طور طریقے اور ان کے مقابلے، سیاسی معاملات، کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد، ان لوگوں کی ریشہ دوانیاں یا منصوبہ بندیاں جو ذاتی طاقت، شان و شوکت، منصب یا اس قسم کے دیگر مقاصد کے جویا ہوں۔[۲۰]

سیاست وہ عمل ہے جس کے ذریعے مختلف افراد تدبر کے ساتھ ملکی یا علاقائی سطح پر حکومت یا انتظام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیاست عموماً انتظامی تنظیمات، سیاسی جماعتوں اور حکومتی اداروں کے ذریعے ملکی انتظام، قوانین اور نظم و نسق کو جاری رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ سیاست کے ذریعے، حکومتی اداروں، سیاسی جماعتوں اور سیاست دونوں کو عوام کی توقعات اور ان کے مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔

سیاست کی وضاحت کرتے ہوئے جان ایچ ہال ول لکھتا ہے:

> سیاسی نظریہ اور سیاسی فلسفہ انسان اور انسانی معاشرے کے لیے خیر اور صلح کے نظام کے اصولوں کے مطالعے سے عبارت ہے۔ انسان محض زندہ رہنے کے لیے زندہ نہیں رہتا بلکہ اچھی زندگی بسر کرنے کا بھی خواہاں ہوتا ہے۔ یہ اس کی فطرت کا تقاضا بھی ہے اور یہی فطرت کا خاصہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے وجود اور اپنے اعمال کا جواز تلاش کرتا ہے انسان نہ صرف اس کا شعور رکھتا ہے کہ وہ کیا

ہے بلکہ اس کا کیا ہونا چاہیے اور کیا ہو سکتا ہے۔اخلاقیات کے ذریعہ عقلی طور پر اس خیر کی ماہیت کو متعین کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جس کا وہ طلب گار ہے۔سیاسیات میں وہ اسی خیر کو سماجی زندگی میں روبہ عمل لانا چاہتا ہے خواہ اس کوشش میں اپنے آپ کو یا دوسرے کے ہاتھوں کتنی ہی ناکامیوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔اس خیر کو روبہ عمل لانے میں مدد دینا فلسفہ سیاست کا اہم ترین مقصد ہے۔(۲۱)

سیاست کا مقصد معاشرے میں مساوات اور نظام عدل قائم کرنا اور اس کے مطابق اصول وضوابط متعین کرنا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف ماہرین نے سیاست کی مختلف تعریفیں بیان کیں ہیں اور اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ان تصورات اور نظریات کو عام طور پر سیاسی فکر کا نام دیا جاتا ہے۔ان سیاسی افکار و نظریات میں فرق کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ماحول، حالات اور ادوار کے حساب سے جنم لیتے ہیں۔ادب اپنے معاشرے کے ساتھ جڑا ہوتا ہے ۔انسانی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور عوامل چاہے وہ مذہبی ہوں یا سماجی، تہذیبی ہوں یا سیاسی وہ تمام ادب میں پیش کیے جاتے ہیں۔ادیب عام انسان کی نسبت زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھتے ہیں اس کو محسوس کرتے ہیں اور ان کو الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ بعض ادیب جو سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو ان پر سیاست کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ادب اور سیاست کے باہمی تعلق کے حوالے سے مشرف احمد راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ میں لکھتے ہیں۔''ادب سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک پامال مضمون ہے اور یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے سیاست سے۔''(۲۲) سیاست کے اثرات آج کل انسانی زندگی میں نمایاں ہے اور تمام نظام زندگی سیاست کے تابع نظر آتا ہے۔اسی وجہ سے ادیب پر بھی سیاسی نظام کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ان تاثرات وخیالات کو اپنی تخلیقات میں منتقل کر دیتا ہے۔

ہر ریاست کا اپنا نظام زندگی ہے اور اسی کے مطابق اس کے سیاسی و سماجی حالات ہیں۔کسی بھی ادب کے مطالعہ کے دوران یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس ملک کے سیاسی و سماجی حالات ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ قمر رئیس اور عاشور کاظمی کے الفاظ میں ''سیاست ہر جگہ ہے، ہر طرف ہے فن اور ادب کی تخلیق میں ہے۔''(۲۳) ادب کا اپنے ملک کی سیاست سے تاثر ہونا فطری بات ہے لیکن ادیب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو ادب وہ تخلیق کرے اس کا مقصد لوگوں میں سیاسی شعور کی بیداری ہونا چاہیے نہ کہ اسے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جائے۔فرخ سہیل گوئندی سفر نامہ نگار، مصنف، صحافی، تجزیہ نگار اور سوشل ایکٹوسٹ کے طور پر جانے جاتے ہیں اس کے علاوہ سیاست اور تاریخ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، وہ نوجوانی ہی میں سیاست میں دلچسپی لینے لگے اور پاکستان کی جمہوریت کی بحالی اور سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے لگے۔ وہ نہ صرف اپنے ملک کی سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے

ممالک کی سیاست اور تاریخ میں بھی گہری دلچسپی لیتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کا سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات،احساسات وجذبات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان تین ممالک(ایران،ترکی اور بلغاریہ) کی سیاست اور تاریخ کو بھی نہایت عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔

فرخ سہیل دوران سفر جہاں تہران کی یونیورسٹی کی تاریخ سے آگاہ کرتے ہیں وہیں اس پر سیاست کے اثرات کا ذکر بھی کرتے ہیں:

> امام خمینی نے انقلاب کے بعد ایران کی ریاست کو اسلامیانے کا جو عمل شروع کیا،اس میں تعلیمی ادارے سرفہرست تھے۔مساجد کو سیاسی مراکز قرار دیا گیا۔جہاں نمازِ جمعہ کے وقت امام سیاسی خطبے دیتے ہیں۔ملکی اور عالمی سیاست پر تفصیل بیان کرتے ہیں۔چونکہ رہبر انقلاب کی نظر میں سیاست اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے،اس لیے اس اسلامیانے کے عمل میں دانش گاہِ تہران سب سے زیادہ اسلامائزیشن کا نشانہ بنی۔اور یہ یونیورسٹی درحقیقت ترقی پسندوں، کیمونسٹوں اور روشن خیال قوم پرستوں کا گڑھ تھی اور یہی لوگ انقلاب کا پہلا قطرہ بنے۔[۲۴]

فرخ سہیل گوئندی نے جب ایران کا سفر کیا اس وقت وہاں انقلاب ایران برپا تھا،تب وہاں کے لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ایک انقلاب ایران کے نعرے بلند کر رہے تھے اور دوسرے اس کی مخالفت اور امریکہ کی چال کہہ رہے تھے۔انقلاب ایران ۱۹۷۹ء میں ہوا اور فرخ صاحب نے ۱۹۸۳ء میں وہاں کا سفر اختیار کیا۔اس وقت انقلاب ایران کے اثرات بالکل نمایاں تھے اور ہر طرف یہی موضوعِ گفتگو تھا۔دوران سفر فرخ صاحب مختلف لوگوں سے ملے جن سے ان ممالک کی تہذیب،سماج اور سیاست پر گفتگو ہوتی رہی۔اسی دوران ان کی ملاقات ایک ایرانی خاتون سے ہوئی جن سے سیاست پر بحث ہوگئی اس دور میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی اور فرخ صاحب ذوالفقار علی بھٹو کے حمایتی تھے اور انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے لیے اپنی آواز بلند کی۔گوئندی صاحب کے بقول وہ خاتون بھی ذوالفقار علی بھٹو کی مداح نکلیں اور اس دوران جو ان کی گفتگو ہوئی اُس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''اوہ!تم لوگوں نے اتنے بڑے لیڈر کو اپنے ہاتھوں سے ماردیا۔''
> اب اس کا لہجہ بدل چکا تھا،وہ اب بے تکلف نگاہوں سے دیکھنے لگی۔وہ بولے جارہی تھی۔
> ''تم لوگوں نے امریکہ کی سرپرستی میں اسے قتل کردیا۔۔۔ اور وہ جنرل ضیا،سگِ امریکہ۔۔۔''اس نے کہا،''جس روز ذوالفقار علی بھٹو کو تم لوگوں نے پھانسی پر چڑھایا،اس روز میرے بابا نے سینہ پر ہاتھ مارتے ہوئے ماتمی انداز میں کہا،''یزید نے آج کے حسین کو قتل کردیا'' اور ہمارے گھر میں اس روز کھانا نہیں پکا۔[۲۵]

فرخ سہیل صاحب نے اپنے سفر نامے میں دیگر ممالک کی سیاست پر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سیاست پر بھی بحث کرتے ہیں۔ ترقی پسند نظریات اور ذوالفقار علی بھٹو سے لگاؤ کے اظہار کے لیے سفر نامے میں ماؤ کیپ کا ذکر کرتے ہیں یہ کیپ ترقی پسند نظریات کی عکاسی کرتی ہے، ماؤ کیپ کے استعمال اس بات کو واضح کرتا ہے کہ فرخ سہیل ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں۔

لکھتے ہیں:

جلدی سے اٹھا منہ ہاتھ دھویا اور سر پر اپنی پسندیدہ ماؤ کیپ رکھی۔ اب میں سیاح سے زیادہ انقلابی تھا۔ ان دنوں ابھی ہمارے ہاں ترقی پسند سیاسی لوگوں میں کچھ کچھ ماؤ کیپ کا رواج دیکھنے کو ملتا تھا۔ ماؤ کیپ کو عوامی سطح پر متعارف کروانے میں ذوالفقار علی بھٹو شہید کو کریڈٹ جاتا ہے۔ چینی طرز کا سوٹ یا شلوار اور قمیص پتلون کے ساتھ کئی سال ماؤ کیپ استعمال کیا۔ یہاں تو موسم کافی سرد تھا، اس لیے ماؤ کیپ سیاسی مزاحمت اور شناخت کی نشانی کے ساتھ ساتھ موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے بھی جائز تھی۔ (۲۶)

فرخ سہیل گوئندی نے انقلاب ایران کی تاریخ کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاست کو بھی اپنا موضوع بنایا اور سیاست میں ہونے والے واقعات اور عالمی سیاست پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ انقلاب ایران سے قبل ایران میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی اور شاہ کی فوج پر امریکہ کی سرپرستی تھی۔ ظالم شاہ کے خلاف نوجوان لڑکے لڑکیوں نے نعرے بلند کیے ہر طرف "مرگ بر شاہ" اور "مرگ بر امریکہ" کے نعرے گونجنے لگے۔ شاہ ایران کے لیے جگہ تنگ کر دی گئی اور وہ یہاں سے فرار ہو گیا۔ فرخ سہیل لکھتے ہیں۔

تہران کے انقلابی نوجوانوں نے شاہ کے وہاں سے فرار (۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء) کے چھبیس روز بعد شاہی محلات پر ہلہ بولا تو وہاں موجود شاہی محافظ یہ سمجھے کہ کمیونسٹوں نے شاہی محل پر حملہ کر دیا۔ ایران کے شاہی محلات میں یہ خوف شروع دن ہی سے پھیلا ہوا تھا کہ تخت شاہی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ایران کے کمیونسٹ ہیں جو کہ غلط بھی نہیں تھا۔ انقلاب سے چند سال قبل ایک کینیڈین صحافی خاتون سے شاہ ایران نے اپنے انٹرویو میں یہ تسلیم کیا کہ جیلوں میں بند زیادہ لوگ کمیونسٹ ہیں۔ انقلاب ایران میں ہراول دستے کا کردار یہی کمیونسٹ، سوشلسٹ اور ترقی پسند لوگ کر رہے تھے۔ لیکن عالمی سیاست کی شطرنج پر دسترس رکھنے والوں کے کھیل کی اس وقت آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے جب جلاوطن امام خمینی، عراق میں برسوں کی جلاوطنی ختم کر کے مغربی دنیا کے

اہم ترین شہر پیرس میں منتقل ہو جاتے ہیں اس کے بعد وہ انقلاب کے ہیرو کے طور پر میڈیا میں ابھر کر سامنے آتے ہیں اور پھر ایران واپس آتے ہیں۔ شاہ کی روانگی اور امام خمینی کی آمد۔''(۲۷)

جنرل کنعان ایورن نے ترکی میں ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو مارشل لگا دیا اور اس کا جواز جنگ اور سلیمان ڈیمرل اور بلند ایجوت کے درمیان سیاسی کشمکش کو قرار دیا۔ مارشل لاء نافذ کرنے کے بعد ترکی کی اعلیٰ سیاسی قیادت کو گرفتار کرنے کے ساتھ ان پر سنگین مقدمات بھی درج کیے گئے۔ آئین کو ختم کر دیا گیا، سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی اور ملک میں سخت گیر آپریشن شروع کر دیا گیا۔ مارشل لاء حکومت نے سیاست اور زندگی کے ہر شعبے میں سخت فوجی آپریشن کرتی رہی۔ بالآخر ۱۷ جولائی ۱۹۸۲ء کو حتمی آئین پیش کیا گیا جس کے تحت سلیمان ڈیمرل اور بلند ایجوت پر دس سال تک ہر طرح کی سیاسی پابندیاں عائد کر دی گئی، اس آئین کے تحت نیشنل سیکیورٹی کونسل کے مشاورتی اختیارات کو بڑھا دیا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں جب ترکی میں تیسرا مارشل لاء لگایا گیا تو انقرہ میں کردوں کی علاحدگی کے لیے عبداللہ اوجلان نے اپنی تحریک کو تیز کر دیا۔ اس کرد تحریک کو تیز تر اور مضبوط بنانے کے لیے شام نے لبنان میں ان کو تربیت دی اور اس کی سرپرستی سوویت یونین کر رہا تھا۔ سفر نامہ میں فرخ سہیل نے اس سیاسی صورتحال کو تفصیلی بیان کیا ہے۔

جنرل کنعان اور عبداللہ اوجلان کی سیاسی صورتحال پر اس طرح نظر ڈالتے ہیں:

۱۹۷۸ء میں لیجہ (Lice) ترکی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے قہوہ خانے میں ایک طالب علم رہنما عبداللہ اوجلان نے اپنی جماعت پی کے کے (پارٹیہ کنان کردستان) کی بنیاد رکھی جو بعد میں خطے کی سب سے بڑی مسلح مارکسٹ تحریک بن کر سامنے آئی اور ترکی کے اندر انتہائی طاقتور علیحدگی پسند تحریک۔ مارکسٹ، سٹالنسٹ، لیننسٹ نظریات رکھنے والی اس تنظیم نے ترکی کا سب سے بڑا دہشت گرد گروہ کہا اور مانا جاتا ہے۔ جنرل کنعان ایورن نے فوجی آمریت کے دوران تنگ نظر ترک قوم پرستی کو اپنے اقتدار کے دوام کے لیے استعمال کیا اور اس نے کرد علاقوں میں مقامات پر کرد زبان بولنے اور کرد لباس پہننے پر پابندی لگا دی۔ ایسے میں عبداللہ اوجلان کی ''پی کے کے'' ایک شدت پسند علیحدگی پسند تنظیم بن کر ابھری جس نے ترک افواج، جندرما اور ترک پولیس اور سرکاری تنصیبات پر دہشتگردانہ حملوں کا آغاز کر دیا۔ ۱۹۸۱ء کے بعد پی کے کے ترکی کے اس علاقے میں دہشت کا نشان بننا شروع ہوئی جو ایران سرحد سے شروع ہو کر ارضِ روم اور آگے عراق اور شام کی سرحدات تک پھیلا ہوا ہے۔''(۲۸)

جنرل کنعان ایورن ترکی کی فوج کے سپہ سالار تھے انھوں نے ۱۹۸۰ء میں مارشل لاء لگایا اور وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل کو تخت سے گرایا اور بلند ایجوت اور سلیمان ڈیمرل پر دس سال کے لیے سیاسی پابندیاں عائد کر دی۔

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں فرخ سہیل نے دونوں کا سیاسی تقابل کیا ہے:

ایک ڈکٹیٹر نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو اپنے ملک میں مارشل لاء مسلط کر کے اسلام کا پرچم بلند کرنے کا اعلان کیا۔ دوسرے ڈکٹیٹر نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو مارشل لاء مسلط کر کے اپنے ملک میں سیکولرازم اور ترک قوم پرستی کا پرچم بلند کرنے کا اعلان کیا۔ حکمرانی کی منڈی میں وہی مال دستیاب ہوتا ہے جس کی ڈیمانڈ ہو۔ ادھر میرے وطن میں اسلام اور ادھر ترکی میں سیکولرازم اور نیشنل ازم۔ دونوں نے حکمرانی کا مال ڈیمانڈ کے مطابق بیچا۔ میری معلومات کے مطابق، ۵ جولائی ۱۹۷۷ء والے ڈکٹیٹر نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء والے ڈکٹیٹر سے مشورہ کیا کہ اقتدار کو کیسے دوام دیا جائے تو اس نے کہا:

''ذوالفقار علی بھٹو کو مت چھوڑنا''۔۔۔۔

دونوں عوامی رہنماؤں میں ایک بات مشترک تھی کہ دونوں ترقی پسند اور سیکولر تھے جبکہ ان دونوں ڈکٹیٹروں میں جو چیز بنیادی طور پر مشترک تھی، وہ تھا ان کا ''مائی باپ امریکہ''۔۔۔۔[۲۹]

لیون ٹراٹسکی کا اصل نام لیوڈیوی ڈووچ برانسٹائن تھا۔ وہ انقلاب روس کی اہم شخصیات میں شمار ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک انقلابی مفکر اور سوویت یونین کی اشتراکی حکومت کا پہلا وزیر جنگ اور وزیر خارجہ تھا۔ اس نے لیون ٹراٹسکی بطور قلمی نام روس کے عقوبت خانے میں قید کے دوران اختیار کیا۔ ٹراٹسکی نے نوجوانی میں خفیہ مارکسیت پر مبنی سٹڈی اختیار کی اس کے بعد وٹروفا کی موت پر مظاہرے کیے جس سے اس نے اپنے انقلابی ہونے کا آغاز کیا۔ اس نے اپنی تنظیم قائم کر رکھی تھی جس میں شہر کے مزدوروں کو شامل کرنا تھا لیکن سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر وہ ۱۸۹۸ء میں قید کر دیا گیا اور بعد میں رہا ہو کر وہاں سے فرار ہو گیا اور مختلف ممالک سائبیریا، لندن، روس اور ترکی میں رہنے لگا لیکن اس نے اپنی سیاسی سرگرمیاں اور انقلابی سرکشیوں کو نہیں چھوڑا۔ فرخ سہیل گوئندی نے اپنے سفر نامے میں جب اس نے ترکی کا سفر اختیار کیا، اتاترک نے اسکو یہاں پناہ دی اور اس پر سیاسی پابندیاں عائد کیں۔ لکھتے ہیں:

۱۲ فروری ۱۹۲۹ء کو سٹالن نے ٹراٹسکی کو سوویت یونین سے جلاوطن ہونے پر مجبور کیا اور وہ ترکی میں لیون صدف کے نام سے داخل ہوا۔ ترکی اس وقت اپنے بانی قائد مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کی قیادت میں نئی ریاست کی تعمیر و ترقی میں آغاز کر رہا تھا اور ترکی میں کیمونسٹ پارٹی اور کیمونسٹوں کی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دی گئیں تھیں۔ اتاترک نے لیون ٹراٹسکی کو اپنے ہاں سیاسی پناہ دیتے ہوئے سٹالن حکومت سے کہا:

''میں ٹراٹسکی کو اس شرط پر ترکی میں پناہ دوں گا کہ سوویت حکومت میرے ملک میں قتل کرنے کے لیے کوئی سازش اور منصوبہ بندی نہیں کرے گی اور نہ ہی لیون ٹراٹسکی ترکی کی سیاست میں مداخلت کرے گا نہ اس کی تحریریں ترکی میں شائع ہوں گی۔''۔۔۔۔[۳۰]

دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف سیاسی نظام رائج ہیں جن میں جمہوری، سوشلزم اور کمیونزم وغیرہ شامل ہیں۔ کمیونزم ایک ایسا سماجی نظام ہے جس میں ہر فرا اپنی ضرورت اور قابلیت کے مطابق کام کرتا ہے اور اس کے حساب سے دولت حاصل کرتا ہے جبکہ سوشلزم وہ معاشی نظام ہے جس میں دولت کی تقسیم کاوشوں اور شراکت کے مطابق ہوتی ہے۔ کمیونزم کو سوشلزم کی ذیلی شاخ سمجھا جاتا ہے۔ اشتراکیت فرقہ وارانہ ملکیت اور طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے پر زور دیتی ہے۔ اس کا نظریہ سیاسی اور معاشی قسم کا ہے، یہ دولت کی تقسیم کی اساس ضرورت کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ بلغاریہ کا شمار اشتراکی ممالک میں ہوتا ہے۔ فرخ سہیل گوئندی ایک آزاد خیال اور انقلابی ذہن کے مالک ہیں، انھیں دنیا گھومنے اور وہاں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ دنیا کی تاریخ اور سیاست میں بھی دلچسپی ہے اور وہ جن ممالک کا سفر کرتے ہیں وہاں کے سیاسی نظام کا مطالعہ کرتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ آیا کیا جو ان ممالک کی تاریخ اور سیاست کے بارے میں بیان کیا گیا ایسا ہی ہے اور دوسرے ملک میں موجودہ سیاسی نظام سے اس ملک کی صورتحال کیسی ہے اور لوگوں کے کیا تاثرات ہیں۔ بلغاریہ جو کہ ایک سوشلسٹ ملک ہے وہاں کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہاں صرف طالب علم یا جاسوس وغیرہ ہی سفر کر سکتے ہیں لیکن فرخ صاحب کا مقصد دنیا گھومنا اور ان کے بارے میں دلچسپ حقائق جمع کرنا ہے، وہ بلغاریہ کو سرخ جنت قرار دیتے ہیں۔ سوشلسٹ ملک کی تصویر دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> یہ شہر کا اہم ترین سکوئر ہے، جہاں سوشلسٹ بلغاریہ کے قومی دنوں کی مرکزی تقریبات ہوتی ہیں۔ ''لارگو'' کے پچھلی طرف میرے دائیں جانب عمارتوں پر اس تقریبات کے حوالے سے ابھی بھی ناقابل یقین حد تک بڑے بورڈ آویزاں تھے۔ کارل مارکس، لینن، گیورگی دیمتروف، دہقانوں، مزدوروں، محنت کشوں، عورتوں اور بچوں کی سرخ رنگ کی تصویریں ان میں دکھائی دی گئی تھیں کیوں کہ کچھ ہی روز پہلے یہاں ایک تقریب اسی سکوئر میں برپا ہوئی تھی اور اسی مقبرے کی بالکنی پہ بلغاریہ کے صدر تودریو کوف نے مسلح افواج کے فوجی دستوں، سکولوں کے بچوں، خواتین اور طلباء سمیت دیگر شہریوں سے سلامی لی تھی۔ سوشلسٹ ممالک میں ایسی تقریبات کسی آرٹ مظاہرے سے کم نہیں تھیں۔ اس سکوئر پر ٹریفک ممنوع ہے اور بلغاریہ کے سوشلسٹ انقلاب کے دن کے حوالے سے ہی سکوئر کا نام ''ستمبر ۹ سکوئر'' اور اس شاہراہ کا نام ''بلیوارڈز سکی'' (بلیوارڈروس) ہے۔ (۳۱)

اس سفر نامے میں فرخ صاحب نے عالمی سیاست کے ساتھ ملکی سیاست کو بھی بیان کیا ہے۔ ان کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ قاری نہایت دلچسپی کے ساتھ سفر نامہ پڑھتا جاتا ہے اور وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاست سے آشنا ہوتا ہے اور اس

کی سوچ کے نئے در وا ہوتے ہیں اور قاری ایک نئے جہاں میں سفر کرتا ہے اور اس کے سامنے نئے حقائق واضح ہوتے ہیں۔

سماجی عناصر:

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں سماجی عناصر کا مطالعہ کرنے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ سماج کیا ہے؟ ادب اور سماج کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

سماج کے لیے گروہ، انجمن، جماعت، معاشرہ اور سوسائٹی وغیرہ کے مترادف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ سماج ایک وسیع و عریض موضوع ہے، اس کی تعریف کو چند الفاظ یا چند جملوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں ابوالاعجاز صدیقی نے سماج کو یوں بیان کرنے کی کوشش کی ہے:

> سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔ سماجی تعلقات کا یہ نظام بالفاظ دیگر ہمارا سماجی ماحول، ہمارے اوہام و عقائد، افکار و تصورات، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل و تعمیر میں بہت حد تک دخیل ہوتا ہے[۳۲]

سماج کے لیے مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں، سماج ہندی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لیے مترادف لفظ معاشرہ استعمال کیا جاتا ہے جو عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معانی اکٹھا رہنے کے ہیں اور انگریزی میں اس کے لیے سوسائٹی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ فرہنگ تلفظ میں شان الحق حقی نے سماج کا مطلب ''طریق زندگی'' اور ''ساتھ مل کر رہنا'' لکھا ہے جبکہ ڈاکٹر محمد افضال بٹ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

> سماج، معاشرہ یا سوسائٹی انسانوں کے اس بڑے گروہ کو کہتے ہیں جو باہمی تعلق و تعامل کے اعتبار سے انفرادی خصوصیات کا حامل ہو۔ اس میں اقدار حیات اور ثقافت و تہذیب کے ساتھ ساتھ ذہنی، روحانی اور نظریاتی اختصاص اس طور پر موجود ہو جو اسے دیگر مشابہ گروہوں سے ممتاز کرے۔ نیز جذباتی و احساساتی اور شعور و غیر شعوری سطح پر اس کی وحدتی کڑیاں منضبط ہوں۔[۳۳]

سماج ایک مشترکہ روابط قوانین، اصول، اخلاقیات، رسوم، آداب، طبقات اور فرقوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو ایک خاص طبقے، خطے، ملک یا معاشرتی جماعت کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتا ہے۔ سماج ہمیشہ ترقی کے لیے مختلف تغیرات کا باعث بنتا رہتا ہے۔ سماج میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ خاندانی روابط اور آس پاس بسنے والے لوگ ایک سماجی گروہ کی صورت میں جڑے مرتبط ہوتے ہیں۔ سماج میں مختلف تنظیمات لوگوں کو ایک جماعت کی صورت میں ملانے اور اصول وغیرہ قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ سماج میں اخلاقی اقدار اہم

ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کو سمجھنے ان کا خیال رکھنے اور لوگوں کے حقوق کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ سماج میں تعلیم اہم کردار ادا کرتی ہے جو لوگوں میں علم و فن کے ذریعے ترقی کرنے کی صلاحیت کو بڑھاتی ہے اور لوگوں کے اندر معرفت ،مہارتیں اور تجربات و مشاہدات کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے جو سماجی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

انسان اپنے سماج کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور سماج میں موجود لوگوں کے ساتھ وہ کسی نہ کسی رشتے میں پرویا ہوتا ہے مثلاً ماں باپ، بہن بھائی، استاد شاگرد، دوست اور ہمسائیوں سے تعلقات وغیرہ کے رشتے سماج میں موجود لوگوں ایک دوسرے سے استوار رکھتے ہیں۔ انسان تنہا نہیں رہ سکتا اسے جینے کے لیے دوسروں کے سہارے اور مدد کی ضرورت بھی ہوتی ہے اس لیے انسان کو معاشرتی حیوان کہا جاتا ہے۔ سماج ایک رشتوں کا وسیع ہوتا ہے جس میں لوگ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے اور زندگی کو بہتر بنانے کے رشتوں سے ہوتے ہیں اور ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کے اصول و ضوابط تشکیل دیتے ہیں۔ یہی ضابطے آگے چل کر سماج سے کلچر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ کسی بھی سماج کی تہذیب اور ثقافت اس کے سماج کے مجموعی مزاج کے عکاسی کرتی ہے۔ انسان اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، جس طرح سماج کے بغیر انسان کی پہچان نہیں اسی طرح انسانوں کے بغیر سماج وجود نہیں پاتا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا جاتا ہے سماج بھی ترقی پاتا ہے۔ آج کے اور کل کے سماج میں بہت فرق ہے، انسان کی ارتقائی منازل کے ساتھ سماج نے بھی ترقی کی۔

کسی بھی ملک کے ادب کی بات کی جائے تو یہ بات واضح ہے کہ ادب اپنے سماج کا عکاس ہے۔ میتھو آرنلڈ نے اسے ''تنقید حیات'' قرار دیا ہے۔ انسان پر اپنے اردرد ماحول کا بڑا گہرا اثر ہے۔ ایک عام انسان کی نسبت ادیب زیادہ حساس ہوتا ہے، وہ معاشرے کے حالات و واقعات، سیاسی، مذہبی، جذباتی صورتحال کو محسوس کرتا ہے اور وہ اسے اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔ ادب کے مطالعہ کے دوران کسی بھی خطے کی سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشی صورتحال کا جائزہ لیا جاسکتا ہے ڈاکٹر سید محمود کاظمی راجندر سنگھ بیدی (ایک سماجی و تہذیبی مطالعہ) میں ادب اور سماج کے رشتے کے تعلق پر بات کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں۔

> ہر دور کا ادب اپنے معاشرے کی پیداوار ہوتا ہے۔ جس سماج اور جس دور سے ادب کا تعلق ہوتا ہے اس سماج کی علاقائی، جغرافیائی اور تمدنی و تہذیبی خصوصیات نیز اس دور کے سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشی اور دیگر عصری حالات و واقعات، رجحانات و نظریات اس سرمایہ شعر و ادب میں واضح طور پر نظر آجاتے ہیں۔(۳۴)

جبکہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔ ''ادب میرے خیال میں زندگی، تہذیب، کلچر کا عکاس ہے۔ ترجمان اور نقاد ہے میرے خیال میں ادب ایک سماجی عمل ہے۔''[۳۵] ادب کی تفہیم کے لیے سماج سے ادب کا رشتہ جوڑتے ہوئے ڈاکٹر احمد خان لکھتے ہیں۔

> ادب میں سماجیات کا نظریہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ذریعہ ادب اور سماج کے رشتوں کی شناخت ہوتی ہے اور ادب کو سماجی وسائل اور سماج کو ادبی دستاویزوں سے سمجھنے اور پہچاننے میں مدد ملتی ہے۔ ادب میں عصری مسائل، نفسیات، اقدار و افکار کی نہ صرف تجزیاتی پیش کش ہوتی ہے بلکہ بدلتے رجحانات اور تکنیکی تجربات کا بھی احاطہ ہوتا ہے ادب میں ادبا کے رہن سہن، آداب و اطوار اور حالات زندگی کی پیش کش کے ساتھ عام لوگوں کی ذہنی و فکری ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا ادب کی تفہیم میں ادب اور سماج کے رشتہ کا مطالعہ انتہائی مفید اور معاون ہوتا ہے۔[۳۶]

درج بالا بحث کو مد نظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ سماج سے مراد انسانوں کا وہ گروہ ہے جس میں سب مل جل کر ایک ساتھ رہتے ہیں اور یہ انسان اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے کچھ اصول و ضوابط مقرر کرتے ہیں، ان رہن سہن، عقائد و نظریات، افکار اور عقائد سے اس سماج کا کلچر فروغ پاتا ہے۔ فرخ سہیل گو ئندی نے اپنے سفر نامے میں جن ممالک کی سیاحت کی وہاں کی تاریخ اور سیاست کے ساتھ ساتھ ان کے سماج کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کے سفر نامے میں ۱۹۸۳ء میں ایران، ترکی اور بلغاریہ کے سماج کو بیان کیا گیا ہے۔

جب کسی ملک کے سیاسی، معاشی، مذہبی حالات و واقعات میں تغیر آتا ہے تو اس علاقے کا سماج بھی متاثر ہوتا ہے اور اس میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ فرخ صاحب نے ایران کا سفر کیا اس وقت وہاں انقلاب برپا تھا۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا مطالعہ کے دوران میں انقلاب ایران سے قبل اور اس کے بعد کی سماجی صورتحال کی عکاسی ملتی ہے۔ انقلاب ایران سے قبل رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی اور اس کے دور حکومت میں فوجی اور ملکی نظم و نسق میں اصلاحات کی گئیں اور خارجی ممالک کی مراعات ایران سے ختم کرنے کے علاوہ ایران کو بیرونی اثر و رسوخ سے پاک کر دیا۔ ۱۹۷۹ء میں ایران میں انقلاب کی آیا اور رضا شاہ پہلوی کو جلا وطن ہونا پڑا۔ ۱۹۷۹ء میں امام خمینی پندرہ سال کی جلا وطنی کاٹ کر واپس آئے اور تب ایران میں انقلاب برپا ہوا۔ ۱۹۷۹ء میں انقلاب ایران کے بعد ایرانی سماج میں زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انقلاب ایران کے بعد خواتین کے لباس اور عورتوں کے بال بنانے پر حکومتی جانچ پڑتال شروع ہوئی۔ اس سے قبل عورتوں کو لباس میں مکمل آزادی تھی اور ۱۹۳۰ء میں شاہی حکومت نے نقاب پر پابندی لگادی تھی، لیکن انقلاب کے بعد عورتوں کے لیے سیاہ چادر لینا لازمی قرار دیا گیا۔ لباس میں تبدیلی کی صورتحال کا ذکر سفر نامہ میں یوں ملتا ہے۔

سیاہ رات کے اندھیرے میں سیاہ چادروں میں ملبوس اور چادروں میں نکلے کانوں سے آگے تک سفید چہرے دیکھ کر لگا، کسی اور ہی جہاں میں ہوں۔ ایرانی انقلاب کے بعد حجاب اس انقلاب کی پوری دنیا میں ایک شناخت بنا۔ اور پھر ایرانی انقلاب کے بعد دیگر مسلم دنیا میں خواتین میں حجاب ہر آئے سال بڑھتا گیا۔ کہتے ہیں انقلاب ایران کے دوران مغربی لباس پہننے والی خواتین نے سر بازار مغربی لباسوں کے اوپر سیاہ چادریں پہن کر مظاہرے کیے اور یوں نئی مذہبی شناخت اختیار کرنے کا اظہار کیا۔ ایران میں انقلاب کے بعد حجاب کو ریاستی سطح پر نافذ کیا گیا، اس کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں طے کی گئیں۔ (۳۷)

انقلاب سے معاشرے میں جو بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے اثرات خواتین پر بھی پڑے اور خواتین کے افکار ورجحانات میں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ وہ فکری، علمی، ثقافتی اور دیگر شعبوں میں ترقی کی راہ پر گامزن ہوئیں۔ انقلاب ایران کے بعد خواتین کے حقوق پر خصوصی توجہ دی گئی۔ زندگی کے باقی شعبوں میں ترقی کے ساتھ ساتھ عورتوں کو تعلیمی میدان میں بھی آنے کے زیادہ مواقع ملنے لگے۔ اس کے علاوہ عورت کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا گیا وہ جہاں چاہے رات کو بھی تنہا بغیر کسی خوف کے سفر کر سکتی ہے۔ فرخ سہیل اس کا ذکر میں ہوں جہاں گرد میں یوں کرتے ہیں۔

تہران یا ایران کے کسی بھی شہر میں میرے لیے قابل توجہ بات یہ تھی کہ میں نے اکیلی عورت کو دن، شام یا آدھی رات کو بھی بڑا محفوظ پایا۔ گھر، سنسان سڑک یا گلی ہو اور رات گئے، میں نے ایران میں عورت اکیلے بھی اطمینان کے ساتھ چلتی دیکھی۔ یہ اس سماج کی دو خصوصیتوں کی عکاسی تھی۔ ایک یہ کہ عورت رجعتی رسم ورواج میں غلام بنا کر نہیں رکھی گئی، دوسرا یہ کہ قانون کی بالا دستی ہے۔ گو عورت پر انقلاب ایران کے بعد حجاب لازم کر دیا گیا لیکن ایران کی عورت جدید سماج کی شہری لگی۔ ایران کی عورت کو میں نے بڑا پر اعتماد پایا، وہ ہمارے سماج کی عورتوں کی طرح دبی دبی سہمی نہیں۔ (۳۸)

انقلاب کے وقت شہنشاہ ایران کے خلاف نعرے بلند کیے گئے اور اسے ملک بدر ہونا پڑا اس کے لیے اس کی اپنی زمین ہی تنگ کر دی گئی تھی، اس کے دور میں محلات میں کوئی بھی فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے جانے کے بعد ساری صورتحال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔ انقلاب ایران کے وقت ملک میں ایک بے چینی کی کیفیت تھی، ایرانی سماج کی تصویر کشی فرخ صاحب نے اپنے سفر نامے میں عمدہ طریقے سے کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی بڑے غرور سے یہاں اپنے ملک پر حکمرانی اور مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی شطرنج الٹ دینے کی طاقت رکھتا تھا۔ اس کی دھاک چار سو تھی۔ لوگ اس شہنشاہ کی جھلک دیکھنے کو ترستے تھے اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ اپنے ہی لوگوں کی جھلک دیکھنے کو ترسنے لگا اور لوگ اس کے چہرے سے نفرت کرنے لگے۔ اس کی تصاویر، ایران کے ہر شہر اور قصبات میں آئے روز جلائی جانے لگی۔ سڑکوں، شاہراؤں پر ایستادہ شاہ کے مجسمے اکھڑنے لگے۔ بادشاہ کے لیے اپنے ہی ملک کی زمین تنگ ہو گئی۔ وہ جو ان محلات میں گردن تان کر چلتا تھا، اب خوف اور پریشانی میں بے چینی سے اپنے ہی محلات کے خوبصورت لان میں ٹہلنے لگا۔(۳۹)

بیرونی ممالک میں پاکستانی ایک کمیونٹی کی صورت میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ پاکستانی طرز زندگی اختیار کرتے ہیں۔ ان کا رہن سہن، کھانا پینا اور زبان وغیرہ دوسرے ممالک میں پاکستانی معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایران میں بھی پاکستانیوں کی ایک تعداد بستی ہے، وہاں ان کے رہن سہن کے طریقے خالصتاً پاکستانی ہیں جس کو فرخ سہیل اپنے سفر نامے میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کھانوں کا یہ ڈھابہ ہر لحاظ سے پاکستانی ہی لگ رہا تھا۔ وہاں کوئی چیز بھی ایرانی نہیں لگتی تھی۔ مالک کے حلیے سے لے کر گاہکوں کے "آداب" تک اور ڈھابے کی" صفائی کا انتظام"۔ لٹل پاکستان۔۔۔ ہمارے ہاں کھانوں میں لذت کا اوّل و آخر اہمیت دی جاتی ہے۔ ماحول ambience کو نہیں۔

"بالکل پاکستانی ماحول" تھا۔

ثابت مسر کا تڑکا لگے اور ابلے باسمتی چاول اور ثابت مسر میں جا بجا نظر آتے لہسن۔ اوہ لطف آ گیا۔ یوں لگا جیسے ہم لاہور پہنچ گئے ہوں۔ وہاں کوئی ایرانی گاہک موجود نہیں تھا۔(۴۰)

کردستان کرد نسل کے باشندوں پر مشتمل مشرق وسطیٰ کا ایک خطہ ہے جس کی اپنی الگ جغرافیائی اور ثقافتی شناخت ہے۔ کردستان کے علاقے ترکی، شام اور عراق میں منقسم ہیں اور ان کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ دائرۃ المعارف برٹانیکا کے مطابق ترکی میں اکاسی میں سے تیرہ صوبے کرد عوام پر مشتمل ہیں۔ کرد عوام اپنی الگ لسانی اور قومی شناخت چاہتی ہے جس کی بنا پر ترکی، عراق اور شام کے ساتھ ان کے تنازعات چلتے رہتے ہیں، ترکی میں جنوب مشرق میں کرد بستے ہیں۔ یہ ترکی سے الگ کمیونٹی کی صورت میں رہتے ہیں اور ان کا اپنا ماحول، رہن سہن اور طرزِ زندگی ہے جس کی تصویر کشی سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں اس طرح کی گئی۔

دہقان مرد و زن، موسم سرما کی آمد کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کھیتوں میں خشک گھاس کے ڈھیروں پر مٹی لیپ رہے تھے۔ خواتین نے بھی ترک شلواریں اور متعدد نے پتلونیں

پہن رکھی تھیں۔ کرد طرزِ زندگی میں بڑے روشن خیال ہوتے ہیں، کسی بھی طرح وہ ترکوں سے کم روشن خیال نہیں۔ (۴۱)

ترک عوام اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ ترک باشندے جدت اور اصطلاحات میں سب سے آگے ہیں۔ یہ لوگ آزاد خیال ذہنوں کے مالک ہیں۔ اپنے ملک کی ترقی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ ترک عوام نہایت سلیقہ منداور آداب کو ملحوظِ خاطر رکھنے والی اور مخلص قوم ہے یہ ہمدرد، دوسروں کا خیال رکھنے والی اور جانوروں سے بے پناہ محبت کرنے اور ان کے حقوق کا خیال رکھنے والی قوم ہے۔ یہ سیکولر نظریات رکھنے والے ہیں۔ ترکوں میں قوم پرستی بہت زیادہ پائی جاتی ہے، زبان کے استعمال میں ترک قوم بے حد حساس ہے۔ ترکوں کی قوم پرستی کو فرخ سہیل نے اس طرح بیان کیا، لکھتے ہیں کہ

> جب کوئی بھی ترک میرے ساتھ ترکی بولنا شروع کرتا تو میں کہہ دیتاہوں türkçe bilmiyorum (مجھے ترکی زبان نہیں آتی)۔
> مگر اس جواب پر کئی ترک اصرار کرنا شروع کر دیتے ہیں، آتی تو ہے، بول تو رہے ہو۔ ترک جب کسی سے ملتا ہے تو ترکی زبان یوں بولتا کہ اجنبی بھی ان کی زبان سے اس قدر آشنا ہے۔ کئی ایک ترک تو ''قوم پرستی'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے برا مناتے ہیں کہ تم میرے ساتھ ترکی زبان میں بات کیوں نہیں کر رہے۔ چند مرتبہ تو کچھ ترکوں کے ہاتھ میرے گریبان تک پہنچ گئے کہ تم میرے ساتھ انگریزی بولنے کوشش کیوں کر رہے ہو۔ تم ترکی میں ہو، اس لیے ترکی بولو۔ ترکوں کی قوم پرستی میں زبان ایک اہم ستون ہے۔ (۴۲)

چائے ایک ایسا مشروب ہے جو تقریباً دنیا کے ہر خطے میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن چائے کے استعمال کا طریقہ ہر خطے میں اپنا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں چائے میں دودھ کے استعمال کا رجحان ہے جبکہ ایران، ترکی وغیرہ میں سیاہ چائے کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ چائے بنانے اور پیش کرنے کا انداز بھی ہر خطے کا اپنا ہے۔ ایرانیوں کے کپ کا سائز ترکوں کے کپ کی نسبت کئی گناہ بڑا ہوتا ہے۔ ایرانی چائے میں شکر نہیں ڈالتے بلکہ ایک ڈلی منہ میں رکھ لیتے ہیں اور ساتھ چائے کے گھونٹ بھرتے ہیں۔ ترکوں میں چائے بنانے کا انداز جدا ہے جو ان کے سماج کی پہچان ہے، ان کے چائے بنانے کے طریقے کو فرخ صاحب نے یوں بیان کیا۔

> ترک چائے براہِ راست گرم پانی میں نہیں بنائی جاتی بلکہ ساوار کے نچلے حصے میں پانی آگ پر مسلسل ابلتا رہتا ہے اور اوپر والے حصے میں چائے پتی والا پانی۔ چائے لیتے ہوئے نوے فیصد ابلتا پانی اور دس فیصد سے بھی کم چائے پتی والا سیاہ پانی مکس کر لیا جاتا ہے اور پھر چسکیاں لے کر پیتے ہیں۔ ایک

ترک دن میں دس سے بیس گلاس تک چائے لازمی پیتا ہے۔ چائے میں دودھ ڈالنے کو کہا جاتا ہے تو حیران ہوتے ہیں کہ چائے میں دودھ؟[۴۳]

قالین سرد علاقوں کی پہچان ہے۔ ایران، افغانستان، ترکی اور پاکستان کے وہ علاقے جہاں سردی زیادہ ہوتی ہے مثلاً گلگت، چترال اور سکردو وغیرہ میں قالین کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ یہ سرد خطے کے سماج کا حصہ ہے۔ جن علاقوں میں قالین کا زیادہ استعمال ہے اس خطے کے قالین عمدہ ہوتے ہیں ایرانی قالین پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ ترکوں میں گھروں کے اندر جوتے پہننے کا رواج بالکل بھی نہیں۔ کشمیریوں کے ہاں بھی جو قالین بنتے اور فروخت ہوتے ہیں یہ بھی انھوں نے فارسیوں سے سیکھا۔ ترکی کے قالین پوری دنیا میں فروخت کیے جاتے ہیں۔ ترکی میں قالین بافی کا فن نہایت قدیم ہے جو بارہویں اور تیرہویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ ترکی کے دیہی علاقوں میں آمدنی کا بنیادی ذریعہ قالین سازی ہے۔

فرخ سہیل اپنے سفر نامے میں ترکی کے ایک محلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترک، محلے کو محلہ ہی کہتے ہیں۔ سادہ اور صاف ستھرے گھر، صفائی گھروں کے اندر ہو یا باہر ترک اس پر مفاہمت نہیں کرتے۔ ہمارے گھر اندر سے صاف کیے جائیں تو گھر کا کوڑا گلی کے نکڑ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ محلہ کوئی زیادہ خوشحال نہیں تھا، مگر صفائی نمایاں تھی۔ اکثر گھروں کے باہر قالین سکھانے کے لیے ٹنگے تھے۔ قالین سرد علاقوں کی تہذیبی روایت ہے، ایران، ترکی وسطی ایشیا کے گھر قالینوں کے بغیر ہوں یہ ممکن ہی نہیں۔ مگر جوتوں سمیت گھر میں داخلہ ہونا، اس کا تصور ہی نہیں۔[۴۴]

۱۹۲۳ء میں ترکی میں مصطفی کمال اتاترک نے سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے ایک نئی اور جدید ترکی کی بنیاد رکھی جو سماجی طور پر جمہوریت پسند اور ایک کھلے اور جدت پسند معاشرے کا قیام تھا۔ ۱۹۲۳ء کے بعد ترک معاشرے نے بڑی تیزی سے اقتصادی اور معاشی ترقی کی۔ ترک قوم نہایت روشن خیال ہے وہ معاشرے میں جدت کو پسند کرنے والی اور اپنانے والی قوم ہے۔ اسی لیے ترکی میں لکھنے والوں پر کوئی قید نہیں وہ جس طرح کا چاہیں ادب تخلیق کرتے ہیں اور ان کی تخلیقات پر کسی قسم کی کوئی پابندیاں نہیں۔ یہ سب اس سیکولر انقلاب کی بدولت ہے جو ۱۹۲۳ء میں ہوا۔

ترکی کے جدت پسندی کے حوالے سے گوئندی صاحب کا کہنا ہے کہ:

میں نے ترکی کو انتہائی جدید ریاست، جدید قوم اور اپنے آپ پر فخر کرنے والی قوم پایا۔ ترکوں کی قوم پرستی میں ایک عجب فخر ہے۔ سلجوقیوں سے عثمانیوں تک، وہ ماضی کے غرور بھی پالتے ہیں اور آج کے غرور بھی۔ رویے میں خودسر بھی ہیں۔ یورپ اور عرب دنیا میں انھیں "خودسر قوم" ہی

جاناجاتاہے۔روشن خیال ہیں،جدید ہیں مگر بے ہودہ نہیں۔ہمارے ہاں روشن خیالی اور جدیدت کو بے ہودگی اور عیاشی کے معنی میں لیاجاتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے سیکولرازم کو الحاد اور کفر۔ترک اپنے سیکولر ہونے پر فخر کرتے ہیں۔(۴۵)

ترکی ایک جمہوری اور سیکولر ملک کے طور پر جاناجاتاہے۔اس لیے مذہب کے حوالے سے ہمارے یہاں بہت سے خدشات پائے جاتے ہیں ایک سیکولر ملک میں نماز اور اذان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن ترکی میں اس کے بر عکس صورت حال ہے۔ترکی میں امام مسجد کے پاس اگرالٰہیات میں ماسٹرز کی ڈگری نہ ہو تو وہ امام مسجد کے عہدے پر فائز نہیں ہو سکتا، مؤذن کے لیے خوش الحانی کا کورس ضروری ہے۔اس کے علاوہ وہاں مرد و خواتین نماز کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔ مساجد میں واش رومز مسجد سے کوسوں دور ہیں، مساجد کے احاطے میں ٹوائلٹس ممنوع ہیں اور ان کی صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھاجاتاہے۔

فرخ سہیل اپنے سفر نامے میں ترکی کے سماج کاذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صفائی، طہارت، سلیقہ اگر ترکوں کے گھروں اور دکانوں میں امڈا نظر آتا ہے تو مسجد میں اس سے بھی کہیں زیادہ۔میں ترک نمازیوں کے ہمراہ حمیدیہ جامع میں داخل ہوا۔وضو کے لیے صاف شفاف کاانتظام تھا۔شہزادوں کے جزیرے میں واقع عثمانی دور کی حمیدیہ جامع میں ترک امام کے پیچھے نمازِ عصر ادا کی۔امام مسجد صاحب سوٹ، ٹائی، عبایااور سفید سوٹ پہنے ہوئے تھے۔خواتین بھی اسی دروازے سے مسجد میں نماز کی ادائیگی کے لیے داخل ہوئیں جہاں سے مرد حضرات۔البتہ ان کی نماز کے علیحدہ حصہ مختص تھا۔سب مرد و خواتین نے امام کے پیچھے نماز ادا کی۔(۴۶)

بلغاریہ ایک سوشلسٹ ملک ہے اور اس کے بارے میں ہمارے ہاں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہاں نہایت سخت ماحول ہے۔وہاں کسی قسم کی کوئی آزادی نہیں۔وہاں سرمایہ دارانہ نظام ہے۔بلغاریہ میں ہر کام میں انتہائی نفاست سلیقہ اور صفائی پائی جاتی ہے۔بلغاریہ ایران، ترکی اور ہندوستان سے بالکل الگ ملک ہے۔فرخ سہیل بلغاریہ کے ملک کی تصویر کشی کرتے ہوئے سفر نامے میں اس طرح سے ذکر کرتے ہیں جو سوشلسٹ ملک کی عکاسی کرتا ہے۔

ٹرین کے دونوں اطراف درختوں کی قطاریں برقرار تھیں، پھلوں سے لدے درخت، سیب اور سرخ ناشپاتیاں اور ان کے پیچھے صوفیہ سے باہر کا ایک صنعتی زون، کارخانے، ملیں، کارخانوں کی دیواروں پر سوشلسٹ آرٹ، محنت کش عورتوں اور مردوں کی مصوری، کچھ کارخانوں پر سوشلسٹ بلغاریہ کے پرچم، کئی ملوں پر سوشلسٹ ستارہ اور اشتراکی نشان، ہتھوڑا اور درانتی بھی مختلف طریقوں سے سجے تھے۔پینٹنگز کی شکل میں بھی اور تانبے اور لوہے سے بنے میورل بھی۔
ایک چھوٹی سی سڑک پر ریلوے پھاٹک آیا جہاں ایک خاتون اہلکار گیٹ بند کر کے سبز تختی لیے

کھڑی تھی۔ سڑک کے کنارے تین چار منزلہ بلند ایک مجسمہ...جوش جذبات سے سر بلند ہاتھ۔(۴۷)

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں آگے چل کر سوشلسٹ بلغاریہ کے سماج کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ستمبر ۹ سکوئر پر گیورگی دیمتروف سے باہر آنے کے بعد میری کیفیت واقعی ایسی تھی کہ میں کسی اور ہی جہان میں گھوم رہا ہوں، جسے ہمارے ہاں ممنوع دنیا کہا جاتا ہے۔ میں نے دیکھ کر جان لیا کہ یہ واقعی بالکل مختلف دنیا ہے۔ وہاں نہ کوئی کاروباری زندگی تھی اور نہ کچھ خاص خرید و فروخت کی ثقافت اور نہ ہی اشتہار بازی۔ چند ایک مصنوعات کی فروخت کے بورڈ تو تھے مگر بڑے مختصر، نہ ہونے کے برابر، منڈی کی دنیا سے ناآشنا دنیا اور نہ پیدل چلنے والوں کی دوڑیں دیکھنے کو ملیں اور نہ ہی ٹریفک کا ہڑبونگ اور شہر کی صفائی یوں کہ شہر کو ہر روز غسل دیا جاتا ہو۔(۴۸)

سفر نامے میں سماج کی اہمیت کا ذکر کیا جائے تو جو باتیں ہمیں تاریخی کتابوں میں نہیں ملتی اکثر وہ سفر نامے میں بیان کی جاتی ہیں۔ سفر نامہ میں سفر نامہ نگار جس عہد میں سفر کرتا اس عہد کی رسم و رواج، تہذیب، معاشرت، رہن سہن، آداب اور اخلاق وغیرہ غرض جس چیز کو بھی دیکھتا ہے اسے اپنے سفر نامے میں جس انداز سے دیکھتا ہے ان احساسات و جذبات کے ساتھ تفصیلی بیان کرتا ہے۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تینوں ممالک (ایران، ترکی اور بلغاریہ) کے سماج کا ذکر بڑے بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ گوئندی صاحب نے اپنے سفر نامے میں جہاں اس عہد کے سماج کو بیان کیا ہے وہیں اس کے ساتھ ساتھ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ملک کے سیاسی و جنگی حالات کے جو اثرات سماج پر پڑتے ہیں اس کا ذکر بھی کہیں کرتے ہیں اس کے علاوہ وہ تقابل کی صورت میں بھی ایک ملک کے سماج کا دوسرے سماج کے ساتھ کرتے ہیں۔

سفر نامہ اردو ادب کی ایک ایسی مفید اور اہم صنف ہے جس میں علمی، ادبی، تہذیبی، معاشرتی، تاریخی، سیاسی، مذہبی اور سماجی حوالے سے معلومات ملتی ہیں۔ سفر نامہ نگار صرف اس خطے کی تاریخی معلومات ہی نہیں دیتا بلکہ اس علاقے کی سیاست، مذہب، تہذیب وغیرہ کو بھی اپنا موضوع بناتا ہے۔ سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں ہمیں ان تینوں ممالک کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سیاست، مذہب، معاشرت، وہاں کے باشندوں کا رہن سہن، بود و باش، ان کی رسوم و رواج وغیرہ کا بڑے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔زاہد حسین میر،''شبلی کی تصانیف میں سوانحی اور تاریخی عناصر''،مشمولہ مقالہ برائے ایم فل اردو، سینٹرل یونی ورسٹی آف کشمیر،۲۰۱۹ء۔

۲۔خورشید انور،قراۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور(دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۹۳ء)،ص۷۴۔

۳۔فرخ سہیل گوئندی،میں ہوں جہاں گرد(لاہور:جمہوری پبلی کیشنز،۲۰۲۱ء)،ص۴۶۔

۴۔ایضاً،ص۸۴۔

۵۔ایضاً،ص۸۴۔

۶۔ایضاً،ص۸۶۔

۷۔ایضاً،ص۹۶۔

۸۔ایضاً،ص۱۷۱۔

۹۔ایضاً،ص۱۹۰۔

۱۰۔ایضاً،ص۲۵۱۔

۱۱۔ایضاً،ص۳۲۰۔

۱۲۔ایضاً،ص۳۳۹۔

۱۳۔ایضاً،ص۲۵۴۔

۱۴۔ایضاً،ص۳۴۸۔

۱۵۔ایضاً،ص۳۷۸۔

۱۶۔ایضاً،ص۵۳۸۔

۱۷۔ایضاً،ص۵۷۱۔

۱۸۔ایضاً،ص۵۷۲۔

۱۹۔ایضاً،ص۶۰۸۔

۲۰۔ جمیل جالبی(مؤلف)، انگریزی اردو لغت (طبع اوّل)(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء)، ص۱۵۱۱۔

۲۱۔ڈاکٹر سید انوار الحق حقی، ہاشم قدوانی،جدید سیاسی فکر (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء) ص۷۔

۲۲۔ مشرف احمد، راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ(کراچی: نفیس اکیڈمی، جنوری۱۹۸۸ء)، ص۱۹۵۔

۲۳۔قمر رئیس،عاشور کاظمی (مرتبین)،ترقی پسند ادب ،پچاس سالہ سفر،(لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء)، ص۵۹۔

۲۴۔فرخ سہیل گوئندی،میں ہوں جہاں گرد،ایضاً،ص۶۹۔

۲۵۔ایضاً،ص۱۰۳۔

۲۶۔ایضاً،ص۱۸۵۔

۲۷۔ایضاً،ص۱۱۲۔

۲۸۔ایضاً،ص۱۷۲۔

۲۹۔ایضاً،ص۲۳۸۔

۳۰۔ایضاً،ص۵۱۰۔

۳۱۔ایضاً،ص۵۸۵۔

۳۲۔ابوالاعجاز صدیقی(مرتبہ)،کشاف تنقیدی اصطلاحات(طبع دوم)، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ستمبر ۱۹۸۹ء)، ص۱۸۱۔

۳۳۔ڈاکٹر محمد افضال بٹ،اردو ناول میں سماجی شعور (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ص۱۳۔

۳۴۔ڈاکٹر سید محمود کاظمی،راجندر سنگھ بیدی (ایک سماجی و تہذیبی مطالعہ)(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، اکتوبر ۲۰۱۱ء)، ص۱۵۔

۳۵۔ڈاکٹر عبادت بریلوی،تنقیدی زاویے (لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۵۱ء) ص۲۷۔

۳۶۔ڈاکٹر احمد خان،اردو میں تاریخی ناول(دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء) ص۳۷۔

۳۷۔فرخ سہیل گوئندی،میں ہوں جہاں گرد،ایضاً،ص۴۰۔

۳۸۔ایضاً،ص۱۰۲۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۱۲۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۵۴۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۷۰۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۸۷۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۹۹۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۳۲۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۵۱۳۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۵۴۸۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۵۸۶۔

ماحصل

انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انسان زمین پر صدیوں سے آباد ہے۔اتنے عرصے میں انسانی معاشرہ مختلف مراحل سے گزرا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جس طرح انسان کی تہذیب اور معاشرت میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں اسی طرح تاریخ میں بھی تغیرات آئے۔ کیونکہ انسان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان خود۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ سے منسلک مفاہیم میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کبھی اسے ماضی کے حالات وواقعات کا مجموعہ قرار دیا گیا تو کبھی اسے اعداد و شمار اور طبقات کی درجہ بندی کہا گیا۔ کسی مخصوص دور کے آغاز و ارتقا کو ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کو تاریخ کہا جاتا رہا ہے لیکن دور جدید میں جدیدیت کے اثرات کی وجہ سے انسانی اور سماجی علوم کو احاطہ تحریر میں لاتے ہوئے تاریخ کا مطالعہ وسیع تناظر میں کیا جانے لگا اور تاریخ کو سیاسی، مذہبی، سماجی، جنگی، نفسیاتی اور ادبی تنوع عطا کیا گیا۔ انسانی تاریخ شعور اور اقدار کا ایسا عمل ہے جس پر ہر مذہب اور انسانی معاشرے کی بنیاد قائم ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی اقدار بھی بدلتی رہتی ہیں۔ تاریخ کی بنیاد میں اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، مذہبی قوتوں کے ساتھ عصری حالات وواقعات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

تاریخیت سے مراد کسی بھی تخلیقی فن پارے کا جائزہ لیتے ہوئے اس عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور اقتصادی تناظر کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ تاریخیت میں کسی مخصوص عہد کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ادب کا مطالعہ تاریخ کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا ہے کیونکہ تاریخیت میں تاریخ اور ادب کا مطالعہ ایک ساتھ کیا جاتا ہے۔ ادب کے داخلی مطالعہ کے دوران خارجی واقعات کے ساتھ ربط کی کوشش کی جاتی ہے۔ ادب اپنے عہد کے ساتھ منسلک ہوتا ہے، ہر ادیب اپنے ارد گرد کے ماحول اور معاشرے کے ساتھ جوڑا ہوتا ہے۔ ادیب پر اپنے زمانے کے رجحانات اور مسائل کا گہرا اثر ہوتا ہے وہ ان مسائل ورجحانات سے خام مواد لیتا ہے، اس کو خوبصورت لفظوں کا جامہ پہنا کر تخلیق کرتا ہے۔ ادب کا اپنے سماج کے ساتھ ایک مضبوط تعلق ہے۔ ادب، انسان اور تاریخ کا آپس میں گہر تعلق ہے یہ تینوں ایک مثلث کی صورت میں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ادب اور تاریخ کے آپس کے رشتے کی وضاحت سب سے پہلے وکو کے یہاں ملتی ہے۔ وکو نے ادب اور تاریخ کے رشتے کو ایک تاریخی سائیکل کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک تاریخی تبدیلیاں ایک دائرے میں حرکت پذیر رہتی ہیں اور یہ سلسلہ مختتم نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر عہد کی تاریخ میں

ایک ایسا موڑ آتا ہے کہ جہاں تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور سماجی صورتیں ایک ہی وقت میں کئی تبدیلیوں سے دوچار ہوئیں ہیں۔ وکو کے بعد مارکس کے یہاں بھی تاریخ اور ادب کے حوالے سے مباحث ملتے ہیں۔ مارکس نے بھی تاریخ اور ادب کی وضاحت کرتے ہوئے تاریخی گردش کا تصور پیش کیا ہے مگر وہ انسانی تاریخ کے داخلی مطالعے اور جائزہ لینے کے بعد اسے ایک سائنسی دعویٰ کے طور پر نتائج اخذ کرتا ہے۔ سور وکن اور ٹوائن بی کے ہاں بھی سماجی اور تاریخی رویوں کی وضاحت ملتی ہے۔ وہ اپنا نظریہ ویکو کے نظریات سے ہی اخذ کرتے ہیں۔ وکو کے علاوہ ادب کا تاریخی مطالعہ کا تصور ھرڈر اور ییٹس کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک ادبی تاریخ اور اس کی روایات کی تشکیل میں ایک ادبی مؤرخ اپنے تجزیے مرتب کرتا ہے۔ ادبی فن پارے کے مطالعہ کے دوران اس عہد کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی رجحانات کے تناظر میں جانچنا ضروری ہے۔

سفر نامہ غیر افسانوی بیانیہ صنف ہے۔ سفر نامے میں سفر نامہ نگار اپنے سفر کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات اور احساسات و جذبات کی کیفیات کے بیان کے ساتھ وہاں کی تاریخ، تہذیب وغیرہ کو بیان کرتا ہے۔ سفر نامے کی روایت کا ذکر کیا جائے تو اردو ادب میں اٹھارویں صدی کے بعد اس کا ذکر ملتا ہے۔ اردو سفر نامے کے ابتدائی نقوش داستانوں میں نظر آتے ہیں لیکن اس کا باقاعدہ آغاز یوسف خاں کمبل پوش کے سفر نامے عجائبات فرنگ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سفر ناموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ہمیں جدید سفر نامے کی صورت میں ملتا ہے۔ جدید سفر نامہ نگاروں میں فرخ سہیل گوئندی کا نام اہم ہے۔ وہ ایک سیاسی کارکن، سفر نامہ نگار اور صحافی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایران، ترکی اور بلغاریہ کا سفر کیا اور اپنے سفر کی روداد کو مختلف مضامین کی شکل میں رسائل میں چھپواتے میں رہے۔ بعد ازاں ۲۰۲۱ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کروایا۔ ان کا سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تاریخ، سیاست، سماج، تہذیب اور مذہب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک کامیاب سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اسلوب اور طرزِ نگارش کی وجہ سے قارئین کی توجہ اور دلچسپی کو اپنی جانب مرکوز رکھتا ہے۔ بعض اوقات سفر نامے میں تاریخ اور تہذیب کو بیان کرتے ہوئے اس میں سے دلچسپی کا عنصر کھو جاتا ہے اور سفر نامہ محض ایک معلوماتی کتاب بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سفر نامے میں تخیل آمیزی اتنی زیادہ ہوتی ھے کہ اس کا اصل مقصد کھو جاتا ہے۔ فرخ سہیل گوئندی نے اعتدال کے ساتھ کام لیا ہے ان کی زبان سادہ اور طرز اسلوب دلچسپ ہے کہ قاری اپنی پوری توجہ سفر نامے پر مرکوز کیے رکھتا ہے۔ ان کے سفر نامے میں تاریخ اور سیاست جیسے عنوانات کو موضوع بنایا ہے لیکن ان کے اسلوب اور طرزِ نگارش کی بدولت قاری اس کو روانی کے ساتھ پڑھتا جاتا ہے۔ سفر نامے میں تکنیک اور تجربوں کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن سفر نامہ نگار اپنی سہولت کی خاطر مختلف تکنیکوں کی مدد لیتے ہیں جیسے خط یا ڈائری کی تکنیک، پس منظر کی تکنیک اور روزنامچہ کی تکنیک

وغیرہ۔ فرخ سہیل کے ہاں جس تکنیک کا استعمال زیادہ ملتا ہے وہ واحد متکلم کی تکنیک ہے۔ انھوں نے اپنا سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد واحد متکلم کی تکنیک میں لکھا۔ سفر نامے کے فنی و فکری عناصر اس کو جان بخشتے ہیں۔ منظر نگاری، جذبات نگاری، تہذیب و ثقافت اور جزئیات نگاری یہ وہ عناصر ہیں جو سفر نامے کو دلچسپ بناتے ہیں۔ میں ہوں جہاں گرد میں سفر نامہ نگار نے جزئیات سے کام لیا ہے ان کا مشاہدہ عمیق اور تجربہ وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے سفر نامے میں دلچسپ واقعات کے ساتھ اکثر ان چیزوں کو بیان کیا ہے جس پر ایک عام انسان کی نظر کم ہی جاتی ہے۔

زیر نظر مقالے کا عنوان " تاریخیت کے تناظر میں سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا تحقیقی مطالعہ" ہے۔ تاریخیت ادب اور تاریخ کے حوالے سے بحث کرتی ہے کہ تاریخ کیا ہے؟ ادب اور تاریخ کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ کسی متن کی تفہیم میں اس کے عہد کا کیا کردار ہے؟ یہ مقالہ ان سوالات کے جوابات مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ادب اور تاریخ کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ ادب اور تاریخ دونوں ہی اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ دونوں اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور مذہبی صورتحال کے عکاس ہیں۔ کسی بھی عہد کی تہذیب وثقافت، اقدار وروایات اور رسم ورواج کو سمجھنا اور اس کے تناظر میں ادب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ تاریخیت میں ادب کی تفہیم کے لیے اس عہد کے سیاسی، سماجی، مذہبی، تاریخی اور معاشرتی حالات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار سفر نامہ میں اس ملک کی تہذیب اور تاریخ کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور میں پیش آنے والے حالات وواقعات کا چشم دید گواہ ہوتا ہے۔ فرخ سہیل گوئندی کا سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا شمار اردو کے جدید سفر ناموں میں ہوتا ہے۔ یہ ان کا پہلا سفر نامہ ہے۔ اس سفر نامے میں انھوں نے ۱۹۸۳ء کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ اس میں انھوں نے ایران، ترکی اور بلغاریہ کی تاریخ، سیاست، تہذیب اور ان واقعات کو پیش کیا ہے جس کے وہ چشم دید گواہ تھے۔ موجودہ دور میں چھپنے والے سفر ناموں میں میں ہوں جہاں گرد خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سفر نامہ چھوٹے بڑے تقریباً ۹۵ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کی نظر باریک اور مشاہدہ وسیع ہے۔

اس مقالے میں تین ممالک کے اس مخصوص دور کی تاریخ، تہذیب، سماج اور سیاست کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں فرخ صاحب نے ان ممالک کا سفر طے کیا۔ سفر نامے میں موجود ۱۹۸۳ء کے حالات و واقعات کا سیاسی، تہذیبی، سماجی اور تاریخی تناظر میں مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ زیرِ نظر مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں "تاریخیت: بنیادی مباحث" کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں تاریخیت کے بنیادی مباحث پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں ادب کا اپنے عہد سے کیا رشتہ ہے؟ کس طرح ادب اپنے سماج سے متاثر ہوتا ہے؟ ادب کی تفہیم کے لیے اس عہد کا مطالعہ کیوں ضروری ہے؟ جیسے سوالات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں یہ دیکھا گیا ہے کہ تاریخیت ادب اور تاریخ کو متوازی پیرائے میں رکھ کر اس کا جائزہ لیتی ہے اور تاریخ ادب پر حاوی ہے۔ یہ ادب

اور تاریخ کا رشتہ براہِ راست قرار دیتی ہے اور ادب میں تاریخ منعکس ہوتی ہے۔ تاریخیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ فن پارے کے مطالعہ میں اس عہد کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، جنگی اور مذہبی حالات و واقعات کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ پہلے باب کا دوسرا حصہ "سفر نامہ؛ تعارف، روایت اور فن" کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں سفر نامے کی تعریف، ارتقا اور فن پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے اور آخر میں فرخ سہیل گو ئندی کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ سفر نامہ میں سفر نامہ نگار دورانِ سفر پیش آنے والے حالات و واقعات، تجربات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کو بیان کرتا ہے یہ ان واقعات کو خود دیکھتا ہے وہ اپنے سفر نامے میں وہاں کی تہذیب، تاریخ سیاست اور مذہب کو بیان کرتا ہے۔ تاریخیت کے تناظر میں جب سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد کا مطالعہ کیا گیا تو یہ بات واضح ہوتی ہے یہ سفر نامہ ان معیارات پر پورا اترتا ہے جن کا تاریخیت میں تعین کیا جاتا ہے۔ مقالے کا دوسرا باب "سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں زمانی انسلاک: ایک مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔ زمانی انسلاک میں فن پارے کے اندر ان واقعات کا مطالعہ کیا گیا ہے جو اس اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ سیاسی واقعات، جنگی، سماجی اور ملکی حالات زمانی انسلاک کا سبب بنتے ہیں۔ اس باب میں سفر نامے میں موجود ان واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے جو دوران سفر فرخ سہیل گو ئندی نے دیکھے اور مشاہدہ کیا اور انھیں اپنے سفر نامے میں محفوظ کیا۔ ۱۹۸۳ء میں ایران میں انقلاب برپا ہوئے محض ابھی چند برس بیتے تھے جن کے اثرات ایران پر بہت واضح تھے۔ ایران کے بعد انھوں نے ترکی کا سفر اختیار کیا اور ترکی میں تب جنرل کنعان ایورن کا مارشل لاء لگا ہوا تھا۔ ترکی سے بلغاریہ کا سفر کیا تب بلغاریہ میں اشتراکی نظام قائم تھا۔ ان حالات کے اندر فرخ سہیل نے جو واقعات دیکھے اور جن کا مشاہدہ کیا جنہوں نے ملکی نظام کو متاثر کیا اس کو اپنے سفر نامے میں بیان کیا۔ اس باب میں ان ممالک میں پیش آنے والے واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے فرخ سہیل گو ئندی چشم دید گواہ تھے۔ تیسرے باب کا عنوان "سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تہذیبی اقدار کی پیش کش" ہے۔ اس باب میں سفر نامہ میں موجود تینوں ممالک کی تہذیب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فرخ سہیل گو ئندی نے تینوں ممالک کے نظریات، رسم و رواج، رہن سہن، طرزِ زندگی اور بودو باش کو اپنے سفر نامے میں متعارف کروایا ہے۔ چوتھے باب کا عنوان "سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد میں تاریخی، سیاسی، سماجی پیش کش" ہے جس میں تینوں ممالک کی تاریخ، سیاست اور سماج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اردو ادب کی اصناف مثلاً ناول، افسانہ، سفر نامہ اور شاعری وغیرہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کہ ہر صنف ادب میں تاریخ سماج اور سیاست کو موضوع بنایا جاتا ہے کیونکہ یہ معاشرے سے جوڑے ہیں۔ سفر نامہ نگار جب بھی کسی خطے کا سفر کرتا ہے تو وہاں کی تہذیب میں دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ تاریخ سیاست اور سماج کو بھی موضوع بناتا ہے۔ فرخ سہیل گو ئندی کا پسندیدہ مضامین تاریخ اور سیاست ہے وہ اپنے سفر نامے میں ان موضوعات کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ مذکورہ باب میں سفر نامے میں موجود تاریخی، سیاسی اور سماجی

عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے اور سفر نامہ میں موجود تینوں ممالک کی تاریخ سیاست اور سماج ۱۹۸۳ء کے حالات کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس مقالے میں تاریخیت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں ہوں جہاں گرد کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے۔اس سفر نامے میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی حوالے سے جو واقعات پیش کیے گئے ہیں ان میں تاریخیت کے عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ تاریخیت تاریخ کو سمجھنے اور اس کو برتنے کا نام ہے اس تحقیق کے ذریعے ان گمشدہ کڑیوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس عہد کے حوالے سے یہ سفر نامہ تحریر کیا گیا ہے۔اس سفر نامے میں پیش کردہ تاریخی واقعات کی نوعیت اور اس کے اسباب کا مدلل جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

سفر نامہ میں ہوں جہاں گرد واحد متکلم کا بیان کردہ وہ سفر نامہ ہے جس میں سماج، سیاست، معاشرت، اخلاقیات، ادب تاریخی واقعات سبھی اجزا کو بڑی خوبی کے ساتھ سمویا گیا ہے۔ مصنف کا قلم تاریخ، ماضی، حال، سیاست، معاشرت کے حوالے سے یکساں قاری کے لیے معلومات مہیا کرتا ہے جو ایک تاریخی دستاویز تو نہیں مگر ان ممالک کی تاریخ کو جاننے کا اہم ذریعہ ضرور ہے۔

کتابیات

احمد، مشرف۔ راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ۔ کراچی نفیس اکیڈمی، جنوری ۱۹۸۸ء۔

انور، ریاض۔ اصول تمدن۔ کراچی: مکتبہ نظامیہ، ۱۹۵۷ء۔

انور، خورشید۔ قراۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور۔ دہلی: انجمن ترقی اردو ۱۹۹۳ء۔

آغا، وزیر۔ ''سفر نامے کی بحث'' ۔ مشمولہ اوراق، سالنامہ ۱۹۷۸ء۔

بٹ، محمد افضال۔ اردو ناول میں سماجی شعور۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء۔

بریلوی، عبادت۔ تنقیدی زاویے۔ لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۵۱ء۔

بیگ، حامد۔ اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ۔ لاہور: اورینٹ پبلشرز، ۲۰۱۴ء۔

پروین، روبینہ۔ نو آبادیاتی عہد میں خواتین کے سفر نامے: سیاسی و سماجی مطالعہ۔ لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، اکتوبر ۲۰۲۲ء۔

جالبی، جمیل۔ تاریخ ادب اردو، جلد دوم۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۳ء۔

جالبی، جمیل۔ (مؤلف) انگریزی اردو لغت (طبع اول)۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء۔

جین، گیان چند۔ اردو کی ادبی تاریخیں۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء۔

حسن، سبط۔ انقلاب ایران۔ فیض آباد: نور اسلام، ۱۳۹۹ھ۔

حسن، سبط۔ پاکستان میں تہذیب کا ارتقا۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۹ء۔

حسن، محمد۔ ادبی سماجیات۔ دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۳ء۔

حسین، عابد۔ قومی تہذیب کا مسئلہ۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۱۹۰۸ء۔

حقی، سید انوار الحق، قدوانی، ہاشم۔ جدید سیاسی فکر۔ نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء۔

خان، ڈاکٹر احمد۔ اردو میں تاریخی ناول۔ دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، اکتوبر ۲۰۱۱ء۔

دہلوی، محمد سید احمد۔ مرتب فرہنگ آصفیہ، جلد اول۔ نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۷ء۔

رئیس، قمر، کاظمی، عاشور (مرتبین)۔ ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء۔

سدید،انور۔اردو ادب میں سفر نامہ۔لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، س ن۔
سہیل، عامر، احمر، عباس نسیم(مرتبین)۔ ادبی تاریخ نویسی۔ لاہور : پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء۔
شہاب الدین، ڈاکٹر۔"اردو میں حج کے سفر نامے"۔مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۸ء۔
صدیقی، ابوالاعجاز۔(مرتبہ)کشاف تنقیدی اصطلاحات۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ستمبر ۱۹۸۹ء۔
صدیقی، ریاض۔"اردو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت"۔مشمولہ نو تاریخیت(مرتبہ: نسیم عباس احمر)، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء۔
ظہیر، نگار سجاد۔مطالعۂ تہذیب۔کراچی قرطاس گلستان جوہر بلاک، ۲۰۰۰ء۔
عباس، سید ازور، شاہ، ڈاکٹر مطاہر۔"تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت: بنیادی تعقلات" مشمولہ اردو جلد ۹۷ شمارہ ۲، جولائی تا دسمبر ۲۰۲۱ء۔
عبدالقیوم۔تنقیدی نقوش۔ نئی دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۲ء۔
عتیق اللہ، پروفیسر۔"اردو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت" مشمولہ نو تاریخیت (مرتبہ، نسیم عباس احمر)۔ فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۸ء۔
علی، مبارک۔برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات۔جامعہ کراچی: پاکستان سٹڈیز سنٹر، دسمبر ۲۰۰۷ء۔
فیروزالدین، مولوی۔فیروزالغات۔لاہور: فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۱۳ء۔
فراقی، تحسین(مرتب)۔عجائبات فرنگ۔لاہور: مکہ بکس، ۱۹۸۳ء۔
قمر، ناہید۔اردو ادب میں تاریخیت۔اسلام آباد: پورب اکادمی، جنوری ۲۰۱۷ء۔
کاشمیری، تبسم۔اردو ادب کی تاریخ(ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک)۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء۔
کاظمی، سید محمود۔راجندر سنگھ بیدی(ایک سماجی و تہذیبی مطالعہ)۔ دہلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، اکتوبر ۲۰۱۱ء۔
کمال: محمد اشرف۔تنقیدی نظریات اور اصطلاحات۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، دسمبر ۲۰۱۹ء۔
گل، محمد صادق علی۔ فن تاریخ نویسی: ہومر سے ٹائن بی تک۔لاہور: پبلشرز ایمپوریم، اپریل ۱۹۹۳ء۔

گوسندی، فرخ سہیل۔ میں ہوں جہاں گرد۔لاہور: جمہوری پبلیکشنز، ۲۰۲۱۔

ملک، عبداللہ۔ صوفیہ سے چند خطوط ۔لاہور: کوثر پبلشرز، ۱۹۸۶ء۔

میر، زاہد حسین۔ ''شبلی کی تصانیف میں سوانحی اور تاریخی عناصر''۔ مشمولہ مقالہ برائے ایم فل اردو، سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، ۲۰۱۹ء۔

محمود، خالد۔ اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء۔

نیر، ناصر عباس۔ جدید اور مابعد جدید تنقید(مغربی اور اردو تناظر میں)۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، دسمبر ۲۰۰۴ء۔

یوسف، عرفان۔ ''جنرل ضیاالحق اور امریکہ''۔ مشمولہ روزنامہ دنیا، ۱۸ اگست ۲۰۲۲ء۔

http://urdùalarabiya.nd/politics/2015/7/4